مارچ ۱۹۹۱ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حکم و عبر (استقبالِ رمضان)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایت القرآن (۴۸)	مولانا محمد تقی امینیؒ	۸
قرآن حکیم اور متجددین	ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی	۱۵
علامہ ابن اثیر جزریؒ (کاروانِ حدیث: ۱۴)	عبدالرشید عراقی	۲۲
حکمتِ اقبال (۳۱)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۲۵
اسلامی معیشت میں سادگی کی اہمیت	ڈاکٹر امین اللہ وشیر	۳۵
نقطۂ نظر (تصویر اور فوٹو کی شرعی حیثیت)	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۴۴
لغات و اعراب قرآن (۲۲)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۹
ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۲)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۶۱

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

روزہ اور قرآن کی شفاعت

حدیثِ نبوی

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کریگا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اسکے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اسکو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، لہٰذا آج اسکے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول کی جائیگی اور اس کیلئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائیگا

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

12-3-91

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۰ | مارچ ۱۹۹۱ء شعبان ۱۴۱۱ھ | شمارہ ۳

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاھور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس : داؤد منزل متصل شاہ بکری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

'حکمت قرآن' کے پچھلے شمارے میں قرآن کالج کی ایف اے کلاس میں نئے داخلوں کے بارے میں یہ اعلان قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا کہ میٹرک کے رزلٹ کا انتظار کئے بغیر رمضان المبارک کے فوراً بعد طلبہ کو داخلہ دے دیا جائے گا تاکہ طلبہ کو فرسٹ ایئر کے بورڈ کے امتحانات کی تیاری کرانے کے لئے قدرے زائد وقت ہمیں مل سکے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ قارئین کو یہ اطلاع دینی ہے کہ اس پروگرام میں بوجوہ ایک بڑی تبدیلی کی گئی ہے جو سطورِ ذیل میں مذکور ہے۔

پچھلی کسی اشاعت میں یہ بات وضاحت سے عرض کی جا چکی ہے کہ بورڈ کا یہ حالیہ فیصلہ کہ ایف اے فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے امتحانات آئندہ سے جدا جدا ہوا کریں گے' ہمارے لئے خاصی دشواری کا باعث بنا ہے۔ قرآن کالج کے طلبہ کے لئے ہم نے عربی زبان کو بطور ایک مستقل مضمون کے لازمی قرار دیا ہے اور وقت یہ ہے کہ کالج میں داخلے کے امیدوار طلبہ کی اکثریت عربی زبان کے حروف تہجی سے بھی ناواقف ہوتی ہے۔ آئندہ فرسٹ ایئر میں داخلے کے صرف سات آٹھ ماہ کے بعد ہی فرسٹ ایئر کا بورڈ کا امتحان درپیش ہوگا۔ اتنی مختصرمدت میں طلبہ کو عربی زبان کی اتنی استعداد بہم پہنچا دینا کہ وہ ایف اے کی سطح کے امتحان میں شریک ہو سکیں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ویسے عربی تو ایک طرف رہی میٹرک پاس طلبہ کی انگریزی کا حال بھی کچھ کم تشویشناک نہیں ہوتا۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سکولوں میں کئی سال انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اکثر طلبہ انگریزی گرامر کے بالکل ابتدائی اصولوں سے بھی ناواقف محض ہوتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں بالعموم معیار تعلیم اتنا گر چکا ہے کہ میٹرک پاس طلبہ کی اکثریت میں چھٹی جماعت کے طلبہ جتنی لیاقت بھی مفقود نظر آتی ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مزید سوچ بچار اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ قرآن کالج میں ایف اے کے طلبہ کو بی اے کے طلبہ کی طرح ایک سال اضافی لگانا ہوگا۔ اس اضافی سال میں ہم طلبہ کو عربی اور انگریزی ہی نہیں اردو زبان بھی پڑھائیں گے تاکہ ان میں فی الواقع اتنی لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ایف اے کے امتحانات محض نصاب کو رٹ کر نہیں' اپنی قابلیت کے بل پر اچھے نمبروں میں پاس کر سکیں اور تاکہ مستقبل میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ایک ٹھوس بنیاد انہیں حاصل ہو سکے۔ چنانچہ آئندہ سے قرآن کالج میں ایف اے کی تعلیم دو سالوں کی بجائے تین سالوں میں مکمل ہوگی تاہم پھر بی اے کے لئے طلبہ کا مزید

(باقی صـ۱۴ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

استقبالِ رمضان

ماہِ رمضان المبارک کی آمد پر نبی اکرمؐ کا ایک خطبہ اور اس کی تشریح

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِیِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ یَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ شَھْرٌ مُّبَارَکٌ شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا۔ مَنْ تَقَرَّبَ فِیْہِ بِخَصْلَۃٍ مِّنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْہِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ وَھُوَ شَھْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُہُ الْجَنَّۃُ وَشَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ وَشَھْرٌ یُّزَادُ فِیْہِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ۔ مَنْ فَطَّرَ فِیْہِ صَائِمًا کَانَ لَہٗ مَغْفِرَۃً لِّذُنُوْبِہٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِہٖ مِنَ النَّارِ وَکَانَ لَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِہٖ شَیْءٌ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَیْسَ کُلُّنَا یَجِدُ مَا یُفَطِّرُ بِہِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعْطِی اللّٰہُ ھٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰی مَذْقَۃِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَۃٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاہُ اللّٰہُ مِنْ حَوْضِیْ شَرْبَۃً لَّا یَظْمَأُ حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّۃَ وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْکِہٖ فِیْہِ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ وَاَعْتَقَہٗ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ البیہقی۔ فی شعب الایمان)

امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ خطبہ حضرت سلمانؓ فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی کتاب شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ حضرت سلمانؓ فارسی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا تھا۔

اب آپ چشم تصور سے یہ دیکھئے کہ آج سے چودہ سو برس قبل مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جمع ہیں اور ان کے سامنے رمضان المبارک کے بیان کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں!

عن سلمان الفارسی قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اخر یوم من شعبان فقال..... "حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک خطبہ دیا' اس میں ارشاد فرمایا"..... "یایھا الناس فقد اظلکم شھر عظیم ..... "اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے"..... "ظل" سایہ کو کہتے ہیں۔ گویا رمضان کا سایہ شعبان کی آخری تاریخ سے پڑنا شروع ہو جاتا ہے..... شھر مبارک۔ "یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے....." شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر۔ "اس (مبارک) مہینہ میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے"..... حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں قرآن مجید کی سورۃ القدر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ انا انزلنا فی لیلۃ لقدر ○ وما ادراک ما لیلۃ القدر ○ لیلۃ القدر خیر من الف شھر ○ "ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور (اے نبی!) آپ کیا سمجھے کہ شب قدر کیا چیز ہے! (یہ) شب قدر (خیر و برکت میں) ہزار مہینوں سے بہتر ہے"..... خطبہ میں حضورؐ نے آگے ارشاد فرمایا۔ جعل اللہ صیامہ فریضۃ و قیام لیلہ تطوعا..... "اللہ نے اس مہینہ کا روزہ رکھنا فرض ٹھہرایا ہے اور اس کی رات میں قیام کرنے (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا ہے"..... اس بات کو میں آگے چل کر وضاحت سے بیان کروں گا کہ نماز تراویح کی کیا اہمیت ہے' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے' اور پھر یہ کہ رمضان المبارک کی راتوں کے قیام کی اصل روح کیا ہے! اس کا قرآن مجید کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کی عظیم ترین افادیت کیا ہے!! البتہ اس وقت پھر نوٹ کر لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں الفاظ ہیں! جعل اللہ صیامہ فریضۃ

و قیام لیلہ تطوعا۔ ظاہربات ہے کہ قیام اللیل تو ہر شب میں نفل ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ سے صاف متبادر ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام الیل کی خصوصی اہمیت و فضیلت ہے۔ اگرچہ فرضیت نہیں ہے' لیکن اللہ کی طرف سے اس کا تطوع اور اس کی مجعولیت ثابت ہے۔ چونکہ دونوں کے ساتھ فعل "جعل اللہ" آیا ہے..... آگے فرمایا۔ من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضہ فیما سواہ۔ "جو کوئی بھی اس مہینہ میں نیکی کا کوئی کام کر کے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنا چاہے گا تو اسے اس کا اجر و ثواب اتنا ملے گا جیسے دوسرے دنوں میں کسی فرض کے ادا کرنے پر ملے گا۔" یعنی مسنون و نفلی نیکی اس ماہ مبارک میں اجر و ثواب کے اعتبار سے عام دنوں کے فرض عبادت کی ادائیگی کے مساوی ہو جائے گی..... اور ومن ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضہ فیما سواہ۔ "اور جو کوئی اس مہینہ میں فرض ادا کرتا ہے تو اس کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کے برابر ثواب ملے گا"..... گویا اگر ہم اس ماہ مبارک میں ایک فرض نماز ادا کرتے ہیں تو غیر رمضان کی ادا کردہ ستر فرض نمازیں ادا کرنے کے برابر ثواب پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں..... آگے فرمایا۔ وھو شھر الصبر والصبر ثوابہ الجنۃ۔ "اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر و ثواب جنت ہے۔" اس مہینہ میں ایک بندۂ مومن بھوک پیاس برداشت کرتا ہے' جائز طریقہ سے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین سے بھی اجتناب کرتا ہے' لوگوں کی کڑوی کسیلی اور ناخوشگوار باتوں پر خاموشی اختیار کرتا ہے' غیبت و زور سے بچتا ہے۔ یہ تمام کام اور اسی نوع کے نواہی سے بچنا سب صبر کے مفہوم میں شامل ہیں' اور اس صبر کا بدلہ جنت ہے۔ حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں جہاں بشارت ہے وہاں بڑی فصاحت و بلاغت ہے..... آگے فرمایا۔ و شھر المواساۃ "اور یہ آپس کی ہمدردی اور دمسازی کا مہینہ ہے"..... اس لئے کہ جس کسی کو کبھی بھوک پیاس کا تجربہ نہیں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کسی بھوکے پیاسے انسان پر کیا بیتتی ہے۔ اس مہینہ میں اسے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بھوک کسے کہتے ہیں اور پیاس کیا ہوتی ہے! اس طرح یقیناً دل میں انسانی ہمدردی کا ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے..... آگے فرمایا۔ و شھر یزاد فیہ رزق المومن۔ "اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن کے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔" اس میں برکت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہوا۔ من فطّر فیہ صائما کان لہ مغفرۃ لذنوبہ

وعتق رقبته من النار۔ "جو کوئی اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرائے گا' اس کے لئے اس کے گناہوں کی مغفرت بھی ہوگی اور اس کی گردن کا آتش دوزخ سے چھٹکارا پالینا بھی ہو گا"......

آگے فرمایا۔ و کان له مثل اجره ۔ "اور اسے اس روزہ دار کے برابر اجر و ثواب بھی ملے گا"۔ من غیر ان ینتقصُ من اجره شیی ۔ "بغیر اس کے کہ اس (افطار کرنے والے روزے دار) کے اجر میں سے کوئی بھی کمی کی جائے"...... آپ حضرات کو معلوم ہو گا کہ حضرت سلمان فارسی رضؓ ان فقراء صحابہ کرام رضؓ میں سے تھے جن کے پاس اموال و اسباب دنیوی نہ ہونے کے برابر تھے اور جن پر عام دنوں میں بھی فاقے پڑتے تھے۔ ان اصحابؓ کو اتنی مقدرت کہاں حاصل تھی کہ وہ کسی روزہ دار کو افطار کرا سکتے۔ چنانچہ اسی حدیث شریف میں آگے آتا ہے کہ۔ قلنا یا رسول الله لیس کلنا یجد ما یفطر به الصائم" ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر ایک کو تو روزہ دار کا روزہ افطار کرانے کی استطاعت نہیں ہے (تو کیا ہم اس اجر و ثواب سے محروم رہیں گے؟")۔ حضرت سلمان فارسی رضؓ کی اس بات پر حضورؐ نے جو جواب ارشاد فرمایا اسے حضرت سلمان فارسیؓ آگے بیان کرتے ہیں کہ۔ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم یعطی الله هذا الثواب من فطر صائما علی مذقة لبن او شربة من ماء ۔ "تو رسول اللہؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا" یہ ثواب اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی کے ایک گھونٹ ہی پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے گا"...... یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں اس دور میں کھانے پینے کی اشیاء کی جو افراط ہے اس وقت اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت اگر فقراء صحابہ کرام رضؓ میں سے کسی کو افطار کے لئے کہیں سے کچھ دودھ مل جاتا تھا تو وہ اس میں پانی ملا کر لسی بنا لیا کرتے تھے۔ اور کوئی رفیق ایسا بھی ہو جسے یہ بھی میسر نہیں تو اگر وہ اسے اس لسی میں شریک کر لے تو اس وقت کے حالات میں یہ بھی بہت بڑا ایثار تھا۔ ہم کو آج کھانے پینے کی جو فراوانی ہے اس کے پیش نظر ہم حضورؐ کے اس ارشادِ مبارک کی حکمت کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ ان فقرائے صحابہ کرام رضؓ پر کئی کئی دن کے فاقے پڑتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا یہ حال ہوتا تھا کہ کئی کئی دن کے فاقے سے مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی'

لوگ یہ سمجھتے تھے، شاید مجھ پر مرگی کا دورہ پڑا ہے اور لوگ آکر اپنے پاؤں سے میری گردن دباتے تھے۔ شاید اس دور میں یہ بھی مرگی کا علاج سمجھا جاتا ہو..... پھر یہ کہ وہاں پانی کے بھی لالے تھے، پانی بھی بڑی قیمتی شے تھا۔ بڑی دور سے اسے کنوؤں سے کھینچ کر لانا پڑتا تھا۔ ماحول کے اس تناظر میں سمجھئے کہ حضورؐ کے ارشاد مبارک کا اصل منشاء و مدعا کس نوع کے ایثار و قربانی کے جذبے کو پیدا کرنے کی طرف تھا کہ لوگ اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے مقابلے میں اپنے کمزور بھائیوں کی ذات اور ان کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھیں۔ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے..... یہاں ایک ضمنی بات یہ سمجھ لیجئے کہ جدید دور کی عربی میں لبن دہی کو اور حلیب دودھ کو کہا جاتا ہے۔ آگے چلئے حضورؐ کے ارشاد کا سلسلہ جاری ہے، حضورؐ فرماتے ہیں۔ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِیْ شُرْبَةً لَا یَظْمَاءُ حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّةَ "اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا اسے اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی حوضِ کوثر) سے ایسا سیراب فرمائے گا کہ (میدانِ حشر کے مرحلہ سے لے کر بقیہ تمام مراحل میں) اس کو پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا"۔ آگے چلئے، ابھی بیانِ رحمتؐ کا ارشاد مبارک جاری ہے، غور سے سنئے اور پڑھئے، فرمایا حضورؐ نے۔ وَ هُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ۔ "اور یہ مہینہ وہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ یعنی پہلا عشرہ اللہ کی رحمت کا ظہور"۔ وَ اَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ۔ "اور اس کا درمیانی حصہ یعنی دوسرا عشرہ مغفرت خداوندی کا مظہر ہے"۔ وَ اٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ۔ "اور اس کا آخری حصہ یعنی تیسرا عشرہ تو گردنوں کو آتشِ دوزخ سے چھڑا لینے کی بشارت اور نوید سے معمور ہے"۔ وَ مَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِیْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَ اَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ "اور جو کوئی اس مہینہ میں غلام و خادم اور زیر دستوں کی مشقت میں تخفیف اور کمی کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آتشِ دوزخ سے آزادی عطا فرمائے گا۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت کردہ اس حدیث شریف کی رو سے یہ وہ خطبۂ مبارکہ ہے جو نبی اکرمؐ نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا۔ اس سے آپ حضرات کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے کس طرح یہ چاہا کہ لوگ اس عظمت والے اور برکت والے مہینہ سے مستفیض و مستفید ہونے کے لئے ذہناً تیار ہو جائیں۔ اس لئے کہ جب تک کسی شخص کو کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور نہ ہو، اس وقت تک انسان اس سے صحیح طور پر اور بھرپور استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔

سورۃ البقرۃ، آیات ۲۶۱ تا ۲۷۳

خرچ کرنے اور اس کو خالص اللہ کے لیے بنانے کا حکم

اوپر جس قدر حکم و احکام بیان ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق خرچ کرنے سے ہے خاص طور سے جہاد و دعوت کے کام میں تو قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اب ذرا تفصیل سے خرچ کرنے کی طرف رغبت دلائی جا رہی ہے۔ اس کو خالص اللہ کے لیے بنانے کی تاکید کی جا رہی ہے اور ان باتوں سے روکا جا رہا ہے جن کی وجہ سے مال خرچ کرنا نہ اللہ کے یہاں مقبول ہوتا ہے اور نہ اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ
مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ
اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ
حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ
يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۗ لَا يَقْدِرُوْنَ
عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا
وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی (نیکی کی) مثال اُس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں نکلیں۔ ہر بال میں سو سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بڑھاتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ لینے والے کو (اپنے قول و فعل سے) تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس ان کے عمل کا ثواب ہے، نہ انہیں کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سیدھے منہ) مناسب بات کہنا اور (محبّت سے) عفو و درگزر کر دینا اس خیرات و حسنِ سلوک سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچانا ہو۔ اور اللہ بے نیاز و نہایت بردبار ہے[1]

اے ایمان والو! احسان رکھ کر اور تکلیف دے کر اپنی خیرات ضائع نہ کرو، جس طرح وہ شخص ضائع کر دیتا ہے جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کی صاف چٹان ہو، اس پر مٹی کی تہ جم گئی ہو (اور اس میں کھیتی کی گئی ہو) پھر اس پر زوردار بارش ہوئی ہو جس نے اس (چٹان) کو بالکل صاف کر دیا ہو۔ ایسے لوگوں کو ذرا بھی ان کی کمائی ہاتھ نہ لگے گی۔ اور اللہ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا ہے جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں[2]

جو لوگ اپنا مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کے جماؤ کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے اونچی جگہ پر ایک باغ

لگایا گیا ہو اور اس پر زور کی بارش ہوئی ہو جس سے اس کا پھل کئی گنا آیا ہو — اور اگر زور کی بارش نہ ہوئی تو ہلکی بوندیں ہی اس کو سیراب کرنے کے لیے کافی ہوں۔ اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے[۱]
کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کا ایک باغ کھجور اور انگور کا ہو، اس میں نہریں بہہ رہی ہوں، اس باغ میں اور بھی طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہوں، (اس کے مالک کو) بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کے بچے (چھوٹے چھوٹے) کمزور ہوں، ایسی حالت میں باغ پر جھلسا دینے والی آندھی چلی، جس سے وہ باغ جل گیا۔ اللہ تمہارے سامنے اسی طرح (خبردار کرنے کے لیے) نشانیاں بیان کرتا ہے، تاکہ تم لوگ سوچو[۲]

۱۔ اللہ کے لیے دینے کے بعد احسان رکھنا یا تکلیف پہنچانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے خالص اللہ کے لیے یہ کام نہیں کیا اور بندہ سے اس کے صلہ کی توقع رکھی ہے۔ جب اللہ اپنے لیے کام میں زیادہ سے زیادہ دیتا ہے تو پھر بندہ سے صلہ کی امید رکھ کر کام کرنا اس کو گوارا نہیں ہے — یہ اللہ کا غیر معمولی فضل و کرم ہے کہ اس نے صلہ کا تعلق اپنی ذات سے رکھا۔ اور اگر کہیں بندہ سے اس کا تعلق رکھتا تو بندہ اپنے بخل کی وجہ سے صلہ نہ دے پاتا۔ پھر لوگوں میں صدقہ و خیرات اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی رغبت باقی نہ رہتی۔ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" کی پرانی کہاوت بندوں ہی کے طرزِ عمل کی وجہ سے ہے کہ ان سے کسی صلہ کی توقع نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ آیت میں احسان رکھنے اور تکلیف پہنچانے سے ایمان والوں کے صدقہ و خیرات برباد ہونے کی مشابہت ان لوگوں کے صدقہ و خیرات کے برباد ہونے سے دی گئی ہے جن کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا اور جن کے پیشِ نظر صرف دنیا میں نام و نمود اور شہرت ہوتی ہے، اللہ کی رضا اور آخرت کے اجر و ثواب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ یہ مشابہت بڑی سخت ہے اور اس میں بڑی وعید بھی ہے۔

۳ھ صدقہ وخیرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو اور اپنے دل کی خوشنودی کے ساتھ ہو، نام نمود اور شہرت کے لیے نہ ہو۔ اپنے دل کی ناخوشگواری کے ساتھ نہ ہو۔ ایسے صدقہ وخیرات ہی کو اعلیٰ درجہ کی قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور بے حد و حساب اجر و انعام سے نوازا جاتا ہے، جیساکہ آگے مثال دے کر سمجھایا گیا ہے۔

۴ھ یہ بدنیتی کی وجہ سے صدقہ وخیرات کے برباد ہوجانے کی مثال ہے کہ جب اس کو کسی طرف سے سہارا نہ رہا اور مدد کی زیادہ ضرورت ہوئی تو پتہ چلا کہ بدنیتی کی آگ نے سارے اجر و انعام کو جلا دیا ہے، اب محرومی و مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اچھی کمائی اور اچھی پیداوار کو عمدہ طریقہ سے خرچ کرنے کا حکم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا
فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ
يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾
يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ
وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ
مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾
اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾
لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰٮهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ
الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا
يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

اے ایمان والو! اپنی کمائی سے اور اس پیداوار سے جو ہم نے زمین سے پیدا کی ہے پاکیزہ چیزیں خرچ کرو اور خراب چیزوں کے خرچ کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو، جن کو آنکھیں بند کیے بغیر تم خود لینا گوارا نہ کرو، اور سمجھ لو کہ اللہ بے نیاز ہے اور خوبیوں والا ہے[1] شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور بخل کی رائے دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور اپنے فضل کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ بہت وسعت والا جاننے والا ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اعلیٰ درجہ کی سمجھ سے نوازتا ہے اور جس کو اعلیٰ درجہ کی سمجھ دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں[2] اور تم جو بھی خرچ کرو اور جو بھی منّت مانو اللہ اس کو یقیناً جانتا ہے اور اپنے ساتھ بے انصافی کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر صدقہ خیرات لوگوں کے سامنے دو تو وہ اچھا ہے اور اگر لوگوں سے چھپا کر تنگدستوں کو پہنچا دو تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اللہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا اور اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے[3] لوگوں کو سیدھے راستہ پر لے آنا آپکی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ پر لاتا ہے۔ اور جو مال تم خرچ کروگے اس کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا اور جو خرچ کرو اللہ ہی کی خوشنودی کے لیے خرچ کرو۔ اور جو مال خرچ کروگے تمہیں اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا، کسی قسم کی بے انصافی تمہارے ساتھ نہ ہوگی صدقہ خیرات ان تنگدستوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ کے کاموں میں مشغول ہیں اور دوڑ دھوپ کرکے روزی نہیں حاصل کرسکتے ہیں۔ ناواقف لوگ ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں۔ آپ ان کے چہرہ سے ان کو پہچان لیں گے، وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے ہیں۔ اور جو بھی تم خرچ کرتے ہو وہ سب اللہ کے علم میں ہے[4]

ل صدقہ و خیرات اگرچہ تنگدستوں اور محتاجوں کے ہاتھ میں جاتا ہے لیکن اس کا براہِ راست تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اس بناء پر اس کا معیار اونچا ہے۔ اچھا مال ہو، خراب نہ ہو، حلال ہو، حرام نہ ہو، جائز طریقہ سے کمایا گیا ہو، ناجائز طریقہ سے کمایا ہُوا نہ ہو۔ آیت میں طیّبٰت (پاکیزہ صاف ستھرا) کا لفظ سب کو شامل ہے۔

ل۲ شیطان انسان کی بھلائی نہیں چاہتا ہے اس لیے وہ صرف دنیوی فائدہ و نقصان کی بات کرتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ انسان کی بھلائی چاہتا ہے اس لیے دنیا و آخرت (حال و مستقبل) دونوں کو ملحوظ رکھ کر بات کرتا ہے اور اس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ اونچی سمجھ یہ ہے کہ صرف حال (دنیا) انسان کے سامنے نہ رہے بلکہ مستقبل (آخرت) بھی اس کے پیشِ نظر رہے۔ روزمرّہ کی زندگی میں بھی وہی شخص سمجھدار اور ہوشیار مانا جاتا ہے جس کی نظر دُور تک ہو، صرف حال ہی میں اُلجھ کر نہ رہ جائے، بلکہ آئندہ کو دیکھ کر منصوبہ اور پلان تیار کرے۔

ل۳ اگر لوگوں کے سامنے دینے میں ان کو شوق و رغبت دلانا ہو تو سامنے دے، ورنہ چھپا کر دینا چاہیئے۔ اس میں لینے والے کی عزتِ نفس کا بھی لحاظ ہو جاتا ہے۔ آیت میں دونوں صورتوں کو بہتر کہا گیا ہے، لیکن دوسری صورت کی طرف زیادہ رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

ل۴ یہ لوگ اللہ کی راہ میں اور دین کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، روزی کمانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے ہیں، غیرت مند و خود دار ہوتے ہیں، اپنی حاجت کسی کے سامنے رکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں، اس بناء پر عام طور سے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ آیت میں خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے کہ ان کو تلاش کرو، پہچانو اور ان کی حاجت پوری کرو۔ یہ جو کام کر رہے ہیں وہ سب کا مشترک کام ہے۔ اگر کام چھوڑ کر روزی روٹی میں لگ جائیں گے تو جو کام یہ کر رہے تھے اس کی ذمہ داری ہر ایک پر آ جائے گی، پھر اس کا نباہنا مشکل ہو گا۔

(جاری ہے)

عَنِ الحَارِثِ الاشعَرِی، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ

بِالجَمَاعَةِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجرَةِ وَالجِهَادِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

بقیہ: حرفِ اوّل

کوئی اضافی سال صرف نہیں ہوگا بلکہ ایف اے کے بعد دو ہی سالوں میں قرآن کالج کے طلبہ بی اے کی تکمیل کر سکیں گے۔ گویا ایک میٹرک پاس طالب علم کو قرآن کالج میں بی اے کرنے کے لئے کل پانچ سال درکار ہوں گے۔ اس پانچ سال کے عرصے میں وہ بی اے کے معمول کے نصاب کے علاوہ دینی تعلیم کا ایک متعین نصاب بھی مکمل کرے گا اور ہمیں امید ہے کہ قرآن کالج میں بی اے تک تعلیم مکمل کرنے والا طالب علم انگریزی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں عام کالجوں کے طلبہ کی نسبت بہت بہتر استعداد کا حامل ہوگا۔

قارئین نوٹ فرمالیں کہ قرآن کالج میں ایف اے کلاس کے آئندہ داخلے معمول کے مطابق یعنی میٹرک کا رزلٹ نکلنے کے بعد ہی ہوں گے۔ داخلوں کے لئے میرٹ کا تعین کیا جائے گا اور میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کو ہی معیار نہیں بنایا جائے گا بلکہ طلبہ کی لیاقت کو جانچنے کے لئے ایک درمیانے درجے کا داخلہ ٹسٹ بھی لیا جائے گا جس کے بعد طلبہ کو انٹرویو کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ کالج میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے مندرجہ بالا اقدامات ناگزیر قرار پائے ہیں۔

قرآن کالج لاہور میں

اہم اعلان

دینی تعلیم کے ایک سالہ نصاب

میں داخلے کے خواہشمند حضرات نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ:

- امسال اس کلاس کا آغاز سابقہ معمول کے برعکس رمضان المبارک کے فوراً بعد ہو جائے گا۔
- درخواستِ داخلہ جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۵ رمضان المبارک طے پائی ہے۔
- داخلے کے لیے انٹرویوز ۲۵ اپریل (اغلباً ۹ شوال) کو ہوں گے۔
- تدریس کا آغاز ۲۷ اپریل (۱۱ شوال) سے ہو جائے گا۔
- یہ کلاس ترجیحاً گریجوئیٹ اور پوسٹ گریجوئیٹ حضرات کے لیے ہے۔ تاہم استثنائی حالات میں ایف اے پاس امیدواروں کو بھی داخلہ دیا جا سکتا ہے۔

المعلن: ناظم قرآن کالج، ۱۹۱ اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

قرآن حکیم اور متجددین

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء میں پڑھا گیا

امتِ مسلمہ تین حوالوں سے بڑی ہی خوش بخت اور خوش نصیب ہے:

اولاً ... اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم و بصیرت اور اعتدال و توازن پر مبنی روشن، کامل، عالمی اور پسندیدہ دین حق سے نوازا۔

ثانیاً ... رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، کافۃ للناس، للعالمین نذیرا اور سراجاً منیراً کے حوالے سے ہماری رہنمائی کیلئے ایک ایسے ہادیٔ اعظم کو مبعوث فرمایا جسے بجا طور پر ہادیان عالم میں ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔

ثالثاً ... اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے حوالے سے ہمیں ایک محفوظ اور جامع کتاب مقدس عطا فرمائی گئی جو رب کائنات کی طرف سے اپنے بندوں کیلئے مختلف زمانوں میں نازل کی گئی جملہ ہدایتِ ربانی کا نچوڑ ہے۔

قرآن حکیم وہ صحیفۂ انقلاب ہے جس نے انسانی زندگی کے ہر ہر گوشے کو منور کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے بقول:

"یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں۔ قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے، دلوں کی بیماریوں کیلئے نسخۂ شفا ہے۔ وصول

الی اللہ اور رضائے خداوندی کا راستہ بتاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفسِ انسانی کے مراتبِ کمال کی طرف اشارہ ہے یعنی جو شخص قرآن کریم سے تمسک کرے اُن تمام مراتب پر فائز ہو سکتا ہے .... امام فخرالدین رازیؒ نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت' طریقت' حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف علی الترتیب اشارہ کیا ہے"۔

سید قطب شہید نے بڑی پیاری بات کہی ہے:

فبهذا الفضل الذی اٰتاہ اللہ عبادہ۔ وبهذه الرحمۃ التی افاضها علیهم من الایمان۔ فبذلک وحدہ فلیفرحوا فهذا هوالذی یستحق الفرح۔ لا المل ولا اعراض هذه الحیاۃ"

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن حکیم کی عظمت و اہمیت اور صحابہ کرامؓ کے حوالے سے اس کے کارنامے کو بڑے دلنشین انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"قرآن نے ان کا فکر بدلا' سوچ بدلی' نقطۂ نظر بدلا' اقدار بدلیں' عزائم بدلے' امنگیں بدلیں' شوق بدلے' دلچسپیاں بدلیں' خوف بدلے' امیدیں بدلیں' اخلاق بدلے' کردار بدلے' خلوت بدلی' جلوت بدلی' انفرادیت بدلی' اجتماعیت بدلی' دن بدلا' رات بدلی ...... الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی"

قرآن حکیم ایک زندہ اور روشن معجزہ ہے۔ اس کے اولین مخاطب عرب تھے' اس لئے قرآن حکیم کے فکر انگیز مضامین' اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی صوتی تاثیر سننے والوں پر ایک مسحور کن کیفیت پیدا کر دیتی۔ قرآن حکیم کی لبریز معانی آیات جہاں فرزندانِ توحید کے روح و قلب میں بسی ہوئی بجلیوں کی طرح تحلیل ہو کر ان میں جذب و شوق پیدا کرتیں وہاں کفّار بھی اس کی اثر آفرینی کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ **لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ** پکار اٹھے۔ لوگ قرآن حکیم کے اس قدر دلدادہ تھے کہ قرآن گنگنا کر پڑھتے۔ علامہ خضری کے بقول عہد عباسی میں حفاظ قرآن کی تعداد میں بکثرت اضافہ ہوا۔ عہد عباسی علوم و فنون کی تدوین کا دور ہے۔ اسلامی علوم و فنون کا مخزن و محور قرآن حکیم ہی تھا۔ تاہم براہ راست قرآن حکیم کے تفسیری ادب پر بکثرت کام ہوا۔ اسلام جیسے جیسے غیر عرب

اقوام میں پھیلتا چلا گیا قرآن حکیم کے تراجم و تفسیر کی ضرورت زیادہ پیش آتی چلی گئی اور تفاسیر کا ایک عظیم ذخیرہ معرضِ ظہور میں آیا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے بجا طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ:

"جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجۃً قرآن حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلّۂ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی"۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی عربی، اردو، فارسی، پنجابی اور دیگر مقامی زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم و تفسیر پر بکثرت کام ہوا۔ لیکن بقول ڈاکٹر صاحب:

"آغاز کار میں اس میں ان گروہوں نے بھی حصہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور **ضلّوا واضلّوا** کا مصداق کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو **ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِیْدًا** کی اس حد تک پہنچ گئے کہ امت کو مجبوراً اُن کا تعلق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی۔ اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیّت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی۔ تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب ارتکازِ توجہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصہ لیا ہے لہٰذا ان کا ذکر کیا جا رہا ہے ... اسے کسی بھی درجہ میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے"۔

ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں دیگر مفسرین کے ذکر کے ساتھ سر سید احمد خان مرحوم، مولوی عبداللہ چکڑالوی اور محمد علی لاہوری کی تفاسیر کا ذکر کیا ہے۔

مقالے کے دوسرے حصے میں مجھے انہی مذکورہ بالا متجدّدین کے گروہ کے تفسیری رجحانات اور تفسیری "کارناموں" کا ذکر کرنا ہے، میں انہیں بلا تبصرہ پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ سامعین دریا کا نظارہ اس کی اٹھتی ہوئی موجوں سے براہ راست کر سکیں اور محترم ڈاکٹر صاحب کے قول "**ضلّوا و اضلّوا**" کی حقیقت کی ایک جھلک ان کے سامنے آ جائے۔ سورۃ البقرہ

آیت نمبر ٦٠ "فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ" کی تفسیر کرتے ہوئے سر سید احمد خاں رقمطراز ہیں:

"یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل۔ اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو توریت میں ایلم لکھا ہے۔ وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے"۔

ڈاکٹر عبدالحکیم نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"We said: Climb up the rock with thy rod; and there twelve fountains gushed out."

مولوی عبداللہ چکڑالوی نے عصا سے مراد لاٹھی کے بجائے گروہ لیا۔ لکھتے ہیں:

"فرمایا ہم نے چلا جا تو ساتھ اپنے گروہ کے چشموں والے پہاڑ کی طرف پس (جا کر دیکھا تو وہاں) بہہ رہے تھے اس پہاڑ سے بارہ چشمے بڑے بڑے"۔

خواجہ احمد دین نے اس کی تفسیر میں ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"موسیٰ کا عصا ایسا تھا جو بکریاں چرانے والوں کے پاس ہوا کرتا ہے۔ اس میں لوہا بھی لگا ہوتا ہے اسی عصا سے پہاڑ کو مناسب موقع پر ضرب لگانے کا حکم ہوا تھا"۔

مولوی محمد علی لاہوری اپنی اردو تفسیر میں لکھتے ہیں:

"کسی پتھر کے شق ہو جانے سے پانی کے چشمے کا نکل آنا بھی ایک معمولی واقعہ ہے لیکن بارہ قبیلوں کے ان چشموں پر آباد ہونے کیلئے یہی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ"۔

بشیر الدین محمود نے ایک نیا نکتہ پیدا کیا۔ لکھا ہے:

"اپنا سونٹا فلاں پتھر پر مار"

غلام احمد پرویز نے بڑے ادیبانہ رنگ میں اس مفہوم کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"تم اپنی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تمہیں پانی کی دقت ہوئی اور موسیٰ نے اس کیلئے ہم سے درخواست کی تو ہم نے اس کی راہنمائی اس مقام کی طرف کر دی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا۔ چٹان پر سے مٹی ہٹائی تو اس میں سے ایک دو نہیں اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے"

غرق فرعون کے واقعے کو محمد علی لاہوری نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"The Israelites passed when the sea receded on account of the ebb, and the Egyptians were drowned because the tide was on the time..."

بشیر الدین محمود نے یہی مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس وقت جوار بھاٹا کے اصول کے مطابق سمندر پیچھے ہٹ گیا اور قوم موسیٰ سمندر سے نکل گئی مگر فرعون کے لشکر کے آنے پر پانی کے لوٹنے کا وقت آگیا اور وہ ڈوب گیا"

اسی طرح کا مفہوم دیگر متجددین نے مثلاً یعقوب علی تراب قادیانی، سرسید احمد خاں، غلام احمد پرویز نے بیان کیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ..... کی تشریح کرتے ہوئے غلام احمد پرویز نے لکھا ہے:

"مخالفین کی جن ریشہ دوانیوں کی طرف پیچھے اشارہ کیا گیا ہے ان میں آخری سکیم یہ تھی کہ رسول کو چپکے سے قتل کر دیا جائے لیکن خدا کی اسکیمیں اتنی بلند و برتر ہیں کہ وہ ان کے قیاس و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں چنانچہ وہ اپنی اسکیم کے مطابق اپنے بندے کو راتوں رات بیت الحرام (مکہ) سے نکال کر (مدینہ کی) کشادہ سرزمین کی طرف لے گیا تاکہ اس دور دراز مقام میں جا کر نظام خداوندی کی تشکیل کرے۔ ہم نے اس مقام اور اس کے گردوپیش کو بڑا بابرکت بنایا ہے، اس کی فضا آسمانی انقلاب کیلئے بڑی سازگار ہے"

سورۃ الفیل کی تفسیر میں محمد علی لاہوری نے تحریر کیا ہے:

"اور پرندوں کے بھیجنے میں اشارہ یہ ہے کہ جب لاشیں چھوڑ کر لشکر بھاگ گیا تو پرندوں نے انہیں نوچ نوچ کر پتھروں پر مارا اور کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا"

ڈاکٹر بشارت قادیانی نے نیا نکتہ پیش کیا ہے:

"اغلب ہے کہ کسی دلدل میں جو جراثیم سے بھری ہوئی ہو بیٹھ کر اڑے ہوں۔ ان کے پنجوں پر وہ سوکھی ہوئی کیچڑ لگی ہو جو ابرہہ کے لشکر پر گری اور چیچک کے پھیلنے کا موجب ہو گئی"

مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی نے معجزاتِ عیسیٰ (۳:۴۹) کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے:

"(اور میں یہ سب کچھ کروں) مطابق ارشاد کتاب اللہ کے اور میں بنا کروں ایمانی

اندھوں کو' اور خالص نرالا مومن بناؤں میں ایمانی پھلبہری والوں کو' خصوصاً زندہ کروں میں ایمانی مردوں کو مطابق ارشاد کتاب اللہ کے ....."

مرزا بشیر الدین محمود نے اس مفہوم کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"میں تمہارے (فائدہ کے) لئے بعض طینی خصلت رکھنے والوں سے پرندہ (کے پیدا کرنے) کی طرح (تخلوق) پیدا کروں گا۔ انسانوں میں سے روحانی قابلیت کے لوگوں کو اپنی تربیت میں لے کر ایک دن اس قابل بنا دیتا ہوں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف روحانی پرواز کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ میں خدا بن جاؤں گا اور نہ یہ مراد ہے کہ زندہ پرندے پیدا کروں گا"

غلام احمد پرویز نے قرآن حکیم کی ان آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"وہ اس مردہ قوم سے کہے گا کہ میں تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں اس "وحی کے ذریعے" تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی"

اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ کا ترجمہ کیا ہے:

"یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے"۔

حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے نملہ کو شہزادیٔ نملہ قرار دیا ہے۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ میں "جبال" سے مراد پہاڑی لوگ لئے ہیں۔ ان کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"فرمانبردار بنا رکھا تھا ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑی لوگوں کو بھی۔ ان کی جماعت بھی قرآنی نمازیں پڑھتی رہتی تھی اور قوم طیر بھی ہماری فرمانبردار تھی ....."

محمد علی لاہوری نے "ہدہد" کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ ساری مشکلات اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ہدہد سے مراد یہاں پرندہ ہدہد لیا جاتا ہے حالانکہ اس کا جو کچھ ذکر یہاں آیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ انسان تھا"

غلام احمد پرویز نے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کا ترجمہ اس طرح لیا ہے:

"وہ انقلاب کی گھڑی (جس کے متعلق ان سے اتنی مدت سے کہا جا رہا تھا) بالکل قریب آپہنچی ہے اب ان مخالفین عرب کی قوت و شوکت ختم ہو جائے گی اور ان کا پرچم (جس پر قمر کا نشان ہے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا"

مرزا بشیر الدین محمود نے فرعون کے جادوگروں اور حضرت موسیٰ کے عصا کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے (۷:۱۱۸)

"اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رسیوں میں لوہے کے پیچ چھپائے ہوئے تھے اور سونٹوں میں پارہ بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ حرکت کرتے تھے جیسے آج کل کے یورپ کے کھلونے ہوتے ہیں۔ موسیٰ نے جب ان پر اپنا عصا مارا تو پیچ ٹوٹ گئے اور پارہ نکل گیا اور سب فریب ظاہر ہوگیا۔ اسے محاورہ کی زبان میں نگلنا کہا گیا ہے"

محمد عبداللہ چکڑالوی نے "ذبح ابناء" کی تشریح (البقرہ:۴۹) يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ کی تفسیر اس طرح لکھی ہے:

"ذبح اور قتل سے اس جگہ صرف ذلت اور حقارت ہی مراد ہو سکتی ہے اور ابناء سے مراد ہیں ذی عزت اور ذی قوۃ لوگ...... نساء سے مراد ہیں فقیر حقیر غریب اور عوام الناس"

یہ ایک جھلک ہے متجددین کے تفسیری کارناموں کی۔ ورنہ مضمون بہت وسیع ہے۔ بہرحال اس جھلک سے ان متجددین کے تفسیری رجحانات کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صد تحسین و ستائش کے مستحق ہیں کہ وہ قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر اشاعت کیلئے سعئ بلیغ انجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ مادّیت کے اس دور میں یہ بڑا کٹھن اور دشوار کام ہے لیکن بقول علامہ اقبال ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لا تخف

کاروانِ حدیث
(۱۴)
عبدالرشید عراقی

علّامہ ابنِ اثیر جزریؒ

(م ۶۰۶ھ)

امام ابنِ اثیر کا نام مبارک بن محمد بن محمد بن عبدالکریم عبدالواحد تھا۔ ان کے والد محمد اثیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس لیے ان کی اور ان کے دوسرے بھائی کی شہرت ابنِ اثیر سے ہوئی[1] ۵۴۴ھ میں جزیرۂ ابنِ عمر میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی[2]

ابنِ اثیر کا خاندان علم وفضل کا گہوارہ تھا اور ان کے والد محمد اثیر کو علم وفن سے خاص شغف تھا۔

ابنِ اثیر نے جن اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا، اس کی تفصیل علّامہ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) اور علامہ ابنِ سبکی (م ۷۷۱ھ) نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کی ہے[3] اپنے وطن میں استفادہ کے بعد ابن اثیر بغداد تشریف لے گئے اور بغداد کے اساطینِ فن سے جملہ علومِ اسلامیہ میں تحصیل کی[4]

امام ابنِ اثیر حدیث اور معرفتِ حدیث میں یکتا تھے اور اربابِ سِیَر نے حدیث میں ان کے علمی تبحر کا اعتراف کیا ہے۔ حدیث کے علاوہ تفسیر اور قرآنی علوم میں بھی یگانہ تھے حافظ ابنِ کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

"وَقَرَأَ الْقُرْاٰنَ وَاَتْقَنَ عُلُوْمَهٗ وَحَرَّرَهَا"[5]

(قرآن مجید کا مطالعہ کیا، اس کے علوم میں مہارت بہم پہنچائی اور ان کو قلمبند کیا)

دوسرے علوم میں بھی ابنِ اثیر مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ علّامہ عبدالحی بن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں:

وَكَانَ عَالِمًا فِي عِدَّةِ عُلُوْمٍ مِنْهَا الْفِقْهُ وَالْاُصُوْلُ وَالنَّحْوُ وَالْحَدِيْثُ وَاللُّغَةُ[6]

(وہ متعدد علوم جیسے فقہ، اصول، نحو، حدیث اور لغت وغیرہ کے متبحر عالم تھے)۔

ابن اثیر فقہی مذہب میں امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) کے مسلک سے وابستہ تھے۔[7] علمی کمالات کے ساتھ ساتھ وہ زہد و اتقاء سے بھی متصف تھے۔ اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ فاضلہ کے پیکر تھے۔ اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ علامہ ابن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں:

"وَكَانَ ذَا بِرٍّ وَ اِحْسَانٍ"[8]

(وہ لوگوں کے ساتھ نیک اور عمدہ برتاؤ کرتے تھے

امام ابنِ اثیر نے ذوالحجہ ۶۰۶ھ میں موصل میں انتقال کیا۔[9]

تصانیف :

امام ابنِ اثیر نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کی تمام تصانیف اسلوبِ بیان اور حسنِ تحریر کے لحاظ سے دلکش ہیں۔ سطور ذیل میں ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے :

الانصاف بین الکشف والکشاف :

یہ چار جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس میں ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی (م ۴۲۳ھ) کی 'تفسیر الکشف والبیان' اور ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ) کی 'تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل' کا ماحصل جمع کر دیا ہے۔[10]

النہایہ فی غریب الحدیث والاثر :

یہ غریب الحدیث میں مشہور اور بلند پایہ کتاب ہے۔ علامہ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

" اس فن میں اس سے بہتر اور عمدہ کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی"[11]

طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ :

" اس فن (غریب الحدیث) پر ایسی عمدہ اور بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی"[12]

امام ابنِ اثیر نے النہایہ کو لغت کی کتابوں کے انداز پر حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا ہے۔ اس میں احادیث کے مشکل اور غریب الفاظ کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے

معانی و مطالب بیان کیے گئے ہیں اور ہر لفظ کی تشریح سے پہلے حدیث کا ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔ النہایہ میں صحاح کے علاوہ سنن، جوامع، مسانید اور مصنّفات وغیرہ کی حدیثوں کے غریب الفاظ کی بھی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں امام ابن اثیر نے ایک علمی و تحقیقی اور جامع مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں الفاظ حدیث کی معرفت، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت، فتوحات کے بعد اہلِ عرب کے دوسری قوموں سے اختلاط کے نتیجہ میں غیر زبانوں کے الفاظ کے عربی زبان میں داخل ہونے اور اس فن کی مشہور اور اور اہم کتابوں کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔[۱۳]

النہایہ ابن اثیر پہلی بار ۱۲۶۹ھ میں ایک جلد میں طہران سے شائع ہوئی۔ بعد میں مصر سے ۱۳۰۸ھ/ ۱۳۱۱ھ اور ۱۳۲۲ھ میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔[۱۴]

جامع الاصول فی احادیث الرسول :

امام ابن اثیر کی نہایت گراں قدر تالیف ہے جس میں انہوں نے موطأ امام مالک، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی احادیث کو ابواب و فصول کی تقسیم کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس کے سب سے پہلے نسخے کی کتابت ۶۷۴ھ میں تکمیل پذیر ہوئی تھی۔ اس دور میں یہ کتاب عبدالقادر ارناؤوط کی تحقیق کے ساتھ ۱۲ جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔

وفات : امام ابن اثیر نے ۶۰۶ھ میں موصل میں وفات پائی۔

۱۔ عزالدین ابن اثیر الجزری (م ۶۳۰ھ) صاحب اسد الغابہ

۲۔ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳، ابن سبکی طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۳،

۳۔ ابن خلکان وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۰۳۔ ابن سبکی طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۳۵

۴۔ سیوطی، بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵ ۵۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۴

۶۔ ابن عماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲

۷۔ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۳۵ ۸۔ ابن عماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۔

۹۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۲ ص ۲۰۴ ۱۰۔ ابن خلکان وفیات الاعیان، ج ۲ ص ۲۰۳۔

۱۱۔ سیوطی، تدریب الراوی، ص ۱۹۳، ۱۲۔ مفتاح السعادۃ، ج ۱ ص ۱۱۰۔

۱۳۔ ابن اثیر، مقدمۃ النہایہ، ص ۲ تا ۴۔ ۱۴۔ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین، ج ۲ ص ۳۹۷۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور سائنس

سائنسی تحقیق کا اصل ماخذ

مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ تمام سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ مشاہدۂ قدرت کے لیے دنیا میں سب سے پہلی مؤثر آواز جو بلند ہوئی وہ قرآن حکیم کی آواز تھی، جس کا ارشاد یہ تھا کہ مظاہرِ قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں، کیونکہ ان میں خدا کی صفات جلوہ گر ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اپنے خالق کو پہچانے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے سائنسدان جنہوں نے سائنسی طریقِ تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی مسلمان تھے۔ ان کا مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت خدا کی معرفت کے لیے تھا۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مدار اور محور تھا۔ علم و حکمت کے میدان میں قدیم اہلِ یونان کے کمالات مُسلّم ہیں، لیکن یونانی حکما مشاہدۂ قدرت کو نظر انداز کر کے اپنا سارا زور فقط خیالات اور تصورات پر صَرف کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سائنسی طریقِ تحقیق کے موجد بن سکتے۔ اس سلسلہ میں اقبال لکھتا ہے:

> "یہ بات قطعاً غلط ہے کہ تجرباتی طریقِ تحقیق یورپ کی ایجاد ہے ... یورپ نے اس بات کا اعتراف کرنے میں بڑی دیر کی ہے کہ اس کے ہاں کے مروّج سائنسی طریقِ تحقیق کا اصل ماخذ اسلام ہے۔ تاہم اس بات کا مکمل اعتراف ہو کر رہا ہے۔"

اس کے بعد اقبال برفال (Briffault) کی کتاب "تعمیرِ انسانیت" (The Making of Humanity) سے کچھ عبارتیں اس بات کے ثبوت میں نقل کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی فلسفہ کے اثر سے مسلمان عرصۂ دراز تک رُوحِ قرآن سے غافل رہے لیکن بالآخر

انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اقبال لکھتا ہے:

"سقراط کے صحیح شاگرد کی حیثیت سے افلاطون حسی تجربات سے جو اس کے خیال میں سچے علم کی طرف نہیں بلکہ فقط کسی رائے کی طرف راہنمائی کرتے تھے، نفرت کرتا تھا کس قدر مختلف ہے یہ نقطۂ نظر قرآن سے جو سننے اور دیکھنے کی قوتوں کو خدا کے نہایت ہی قیمتی انعامات سمجھتا ہے اور ان کو اس دنیا میں اپنی اپنی کارکردگی کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کا مطالعہ کرنے والے مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے شروع میں بالکل نہیں سمجھا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ انہیں یہ حقیقت سمجھنے کے لیے (اور وہ بھی پوری وضاحت سے نہیں) کہ قرآن کی روح دراصل یونانی فلسفہ سے متعارض ہے دو سو سال سے بھی اوپر لگ گئے۔ اور پھر اس حقیقت سے روشناس ہونے کا نتیجہ ایک قسم کی ذہنی اور عملی بغاوت میں رونما ہوا جس کی پوری اہمیت آج تک نہیں سمجھی گئی۔"

"لیکن قلبی واردات انسانی علم کا فقط ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے علم کے دو اور ذرائع بھی ہیں یعنی قدرت اور تاریخ! (آگے چل کر اقبال تاریخ کو بھی قدرت میں شمار کر لیتے ہیں، کیونکہ تاریخی واقعات بھی انسانی دنیا میں قدرت کے مظاہر ہیں۔ مصنف) اور جب قرآن علم کے ان سرچشموں سے کام لیتا ہے تو اس کی حقیقی روح پوری شان و شوکت سے بے نقاب ہوتی ہے۔ قرآن سورج اور چاند میں، سایوں کے دراز ہونے میں، رات اور دن کے تغیرات میں، انسانوں کے الوان اور السنہ کے اختلافات میں، دولت مندی اور مفلسی کے ایام کی گردش میں، غرضیکہ قدرت کے ان تمام مظاہر میں جو انسان کے حس کے روبرو جلوہ افروز ہیں، حقیقتِ مطلقہ کے نشانات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ان نشانات پر غور و فکر کرے اور ان سے اس طرح سے نہ گزر جائے کہ گویا وہ بہرا اور اندھا ہے۔ کیونکہ جو شخص اس دنیا میں ان چیزوں کو نہیں دیکھتا، وہ اگلی زندگی کے حقائق کی طرف سے بھی اندھا رہے گا۔ مطالعۂ قدرت کی یہ دعوت اس حقیقت کے تدریجی انکشافات کے ساتھ مل کر قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات اپنی اصل کے اعتبار

سے متحرک اور محدود اور ترقی پذیر ہے آخر کار یونانی فلسفہ کے ساتھ (جس کا مطالعہ مسلمانوں نے اپنے دور کی ابتدائی منزلوں میں نہایت ذوق و شوق سے کیا تھا) مسلمان مفکرین کے تصادم کا باعث ہوئی۔ یہ نہ جاننے کی وجہ سے کہ قرآن کی رُوح دراصل فلسفۂ یونان سے متصادم ہوتی ہے اور یونانی فلسفہ پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ان کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ فلسفۂ یونان کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں۔ رُوحِ قرآن کی حقائق پسندی کے پیشِ نظر اور یونانی فلسفہ کی خیال پرستی کی وجہ سے، جو تصورات سے شغف رکھتا تھا اور حقائق کو نظر انداز کرتا تھا، اس قسم کی کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوائے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس ناکامی کے بعد جو کچھ ہوا وہی ہے جس نے اسلامی تہذیب کی حقیقی رُوح کو آشکار کیا اور تہذیبِ حاضر کے بعض نہایت اہم عناصر کی بنیاد قائم کی۔"

مسلمان سائنس کے موجد اس لیے بنے تھے کہ ان کے سامنے قرآن حکیم کا یہ ارشاد تھا کہ خدا کی معرفت کے لیے قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مرکزی یا بنیادی تصوّر تھا۔

عیسائیت کا نقطۂ نظر

جب اُندلسی مسلمانوں کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اُندلس سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس یورپ کے اُن لوگوں کے ہاتھ آئی جو جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ چونکہ ان لوگوں نے نادانی سے فرض کر لیا تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں ——— ایک پاک اور مقدّس ہے اور دوسری ناپاک اور غیر مقدّس ——— لہٰذا انہوں نے سمجھا کہ کائنات کے مشاہداتی علم کو جسے سائنس کہا جاتا ہے، خدا سے کوئی تعلّق نہیں۔ سائنس اور سائنسدانوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی نے اس فرضی عقیدہ کے لیے مزید ثبوت بہم پہنچایا۔ اور کلیسا اور ریاست کے افتراق نے جو دونوں کے شدید اور طویل جھگڑوں کے بعد ایک اٹل حقیقت کے طور پر رونما ہوا تھا اس عقیدہ کو مزید تقویت پہنچائی اور اس کے لیے راستہ صاف کیا۔ لہٰذا اس عقیدہ نے جامۂ عمل پہنا اور سائنس سے خدا کا نام خارج کر دیا گیا۔ یہ کُلیّتِ وجود میں تفرق پیدا

کرنے اور حقیقتِ کائنات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ایک نامعقول اور افسوسناک جسارت تھی، جس کے پیچھے کوئی عقلی، علمی یا سائنسی دلیل یا شہادت موجود نہ تھی۔ تاہم سائنس کی بے حد اس کا عقیدہ جو اس طرح عیسائیت کے بطن سے پیدا ہوا تھا، عیسائی مغرب کی دنیا میں جڑ پکڑ گیا۔ ظاہر بات ہے کہ سائنس میں اس عقیدہ کے جاگزیں ہونے کے بعد کوئی ایسے سائنسی نظریات پیدا نہ ہو سکتے تھے جو اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ لہٰذا ایسے سائنسی نظریات وجود میں آنے لگے جو دراصل اسی کی پیداوار تھے، لیکن جن کو آسانی سے اس کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسے سائنسی نظریات میں ہم انیسویں صدی کی طبعیاتی مادیت اور میکانیت اور ڈارون کے مادی اور میکانکی نظریۂ ارتقاء کو شمار کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس خیال کو بظاہر ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا کہ قدرت میں کوئی تخلیقی یا راہ نما قوت کارفرما نہیں اور خدا کا عقیدہ مظاہرِ قدرت کی تشریح کے لیے غیر ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ سائنس کی بے خدائیت درحقیقت ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو عیسائیت نے جنم دیا تھا اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔ اب بھی عیسائی مغرب کے سائنسدان یہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ اپنی سائنس کو ہر حالت میں اس راستہ سے بچائیں جو خدا کے عقیدہ کی طرف جاتا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو جائے اس کو سختی کے ساتھ اس چار دیواری میں بند رکھیں جو سائنس کی بے خدائیت کے نامعقول عقیدہ نے اس کے اردگرد بنا رکھی ہے۔

مظاہرِ قدرت آیاتِ اللہ ہیں

ان کی روش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے خدا اور مذہب کے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایسے حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں جو قدرت میں کسی ذہنی یا تخلیقی قوت کے عمل کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں، خواہ وہ ثبوت کیسا ہی بیّن اور آشکار کیوں نہ ہو۔ مثلاً وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جو کسی ذہن کی تخلیقی کارروائی کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً ترتیب، تنظیم، تجویز، تعمیر، تکمیل، وحدت، یکسانیت، تسلسل، تقصید، تطابق، توافق، ریاضیاتی فکر اور زندہ حیوانات کی خودکارانہ نشوونما، جو ان کو برتر اور بلند تر مدارجِ حیات

کی طرف خود بخود لے جاتی ہے۔ اگر یہ اوصاف قدرت کے اندر موجود نہ ہوتے تو قدرت میں کسی چیز کا وجود ہی نہ ہوتا اور طبعیاتی اور حیاتیاتی علوم ممکن نہ ہوتے۔ اس کے باوجود مغرب کے سائنسدان ان کے وجود سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے، کیوں کہ سائنس کی بے خدائیت کے مفروضہ کو تسلیم کرنے کے بعد وہ ان کی کوئی تشریح کر ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ بعض وقت ان میں سے بعض حقائق کی تشریح کے لیے سخت مجبور ہو جائیں تو پھر بھی ان کی تشریح کے لیے خدا کے تصوّر کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرتے، بلکہ کچھ من گھڑت فرضی مابعد الطبعیاتی تصورات کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے کچھ حقائق کی تشریح کے لیے جیمز جینز کسی ریاضیاتی ذہن کو فرض کرتا ہے، برگساں کسی قوتِ حیات کا نام لیتا ہے۔ اور ڈریش کسی عالمی اسکیم یا انٹی لیپی کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ تمام مفروضات فرضی ہونے کے علاوہ ناکافی اور ناتسلی بخش ہیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن تو کارفرما ہو لیکن اس میں شخصیت کے اور اوصاف جو جذبات اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں موجود نہ ہوں؟ یا قدرت میں کوئی ایسی قوت اجسامِ حیوانات کی تخلیق اور تکمیل کے کاموں میں مصروف ہو جو سوچتی سمجھتی ہو، اپنے مقاصد سے آگاہ ہو، اور ان کو حاصل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، لیکن ایک کامل شخصیت نہ ہو؟ ہمارا تجربہ اس قسم کے ادھورے تصوّرات کی نفی کرتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضیاتی فکر یا مقصدیت کے اوصاف جس وجود میں پائے جاتے ہوں وہ شخصیت کے باقی ماندہ جذباتی اور اخلاقی اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ قدرت میں جو ریاضیاتی ذہن یا قوتِ حیات کارفرما ہے وہ خود ہی عالم یا خدا ہی ہے لیکن سائنس کی بے خدائیت کا غیر عقلی عقیدہ مغرب کے سائنسدانوں کو یہ بات سمجھنے سے مانع ہے۔

علم کی نیام بے شمشیر

سائنس کی بے خدائیت پر اقبالؔ بڑے افسوس کا اظہار کرتا ہے اور پُر درد الفاظ میں کہتا ہے:

عشق کی تیغِ جگر دار اُڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

اس شعر میں اور اس قسم کے دوسرے اشعار میں علم سے اقبال کی مراد سائنس ہے اور دوسرا کوئی علم نہیں۔ چنانچہ وہ خود اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے یہ علم! علم حق کی ابتدا ہے۔"

اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عشقِ الٰہی کی تیغ جگر دار سائنس کی نیام کے اندر اپنی جگہ پر موجود تھی اور بعد میں یہ افسوسناک حادثہ پیش آیا کہ کسی نے اس تلوار کو جو دنیا بھر کے تمام باطل تصوّرات اور نظریات کاٹ کر رکھ سکتی تھی اس نیام سے اُڑا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نیام اب تک خالی پڑی ہے۔ یہ تیغ جگر دار کیسے اُڑ گئی اور کس نے اڑائی یہ اقبال اس سوال کا جواب اپنے اشارہ کو بلیغ اور مؤثر بنانے کے لیے سننے والوں پر چھوڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اقبال سائنس کی بے خدائیت کے اس تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی تشریح اُوپر کی گئی ہے۔ اس تیغ جگر دار کو اُڑانے کی ساری ذمّہ داری مغرب کی کوتاہ اندیشی اور مسلمان سائنسدانوں کی کورانہ تقلید پر عائد ہوتی ہے۔

علم حق کا پہلا مرحلہ

اگرچہ بے خدا سائنس الفاظ میں نہیں کہتی کہ خدا موجود نہیں، لیکن انسان اور کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ اور اس کا طریق فکر و عمل ایسا ہے کہ گویا خدا موجود نہیں۔ وہ تمام طبعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح سے کرتی ہے کہ گویا ان کا کوئی خالق نہیں اور اگر ہے تو ان کے ساتھ اب اس کا کوئی تعلّق نہیں اور اس کی صفات کا کوئی نشان اُن کے اندر موجود نہیں۔ اس طرح سے مغربی سائنس اس ایک ہی دروازہ کو بند کر دیتی ہے جس کی راہ سے خدا کی معرفت کا نور سب سے پہلے حضرتِ انسان تک پہنچتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے کہ خدا کی معرفت اور محبت کو بیدار

کرنے کا پہلا ذریعہ انسان کے حواس ہیں، جن کی مدد سے وہ مظاہرِ قدرت میں خدا کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر ہم خالق، ربّ، رحیم، کریم، عادل، حفیظ، علیم، سمیع، بصیر، مومن اور مہیمن ایسے الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکتے جو اوصافِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو سمجھنے کے بغیر خدا کی معرفت و محبّت یا اطاعت و عبادت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے قرآن حکیم کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لیے مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حواس کے بعد خدا کی معرفت کا دوسرا ذریعہ ذکر ہے، جس کی مدد سے پھر انسان قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر بھی خدا کی صفات پر غور و فکر کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہ قدرت کے مشاہدہ سے ان الفاظ کے معنی سمجھ چکا ہوتا ہے جو خدا کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اس ذکر کی کثرت سے خدا کے حضور یا قُرب کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہ احساس قلب کی ایک کیفیت ہے جو عشق یا محبّت سے تعلق رکھتی ہے اور شعور اور ادراک سے بالا ہے۔ اقبال نے اس مطلب کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

علمِ حق اوّل حواس، آخر حضور
آخرِ او مے نگنجد در شعور

ایک اور جگہ اقبال ذکر اور فکر کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَاء
مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطّار
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربّیَ الاعلےٰ

علمِ بے عشق کے خطرناک نتائج

بے خدا سائنس خدا کا انکار کرنے کے بغیر خدا کو نظر انداز کرتی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کو بھی اس طرح سے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ گویا خدا موجود نہیں۔ اور یہ نقطۂ نظر خدا کے انکار سے بدتر ہے۔ بے خدا سائنس نے ہی اس نامعقول اور بے بنیاد عقیدہ کو رواج دیا ہے کہ معیاری فلسفہ وہی ہے جس میں خدا ایک حقیقت کے طور مذکور نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں کائنات کے جس قدر فلسفے پیدا ہوئے ہیں — مثلاً ڈارونزم، مارکسزم، میکڈوگلزم، فرائڈزم، ایڈلرازم، بی ہیویرازم، لاجیکل پازیٹوزم، ہیومنزم وغیرہ — وہ سب بے خدا ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں انسانی فطرت اور انسانی افعال واعمال کے جس قدر نظریات وجود میں آئے ہیں وہ بھی سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست، بے خدا فلسفۂ اخلاق، بے خدا اقتصادیات، بے خدا قانون، بے خدا فلسفۂ تعلیم، بے خدا فلسفۂ تاریخ، بے خدا نفسیاتِ فرد، اور بے خدا نفسیاتِ جماعت۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی سا معصوم سا اور بے ضرر سا حادثہ نہیں جو صرف کتابوں میں ہی رونما ہوا ہو۔ اس نے انسان کی کتابوں کو ہی نہیں بدلا، بلکہ اس کے مقصدوں، قدروں، منصوبوں، امیدوں، آرزوؤں اور حق وباطل، خوب وزشت اور نیک وبد کے پیمانوں اور معیاروں کو بدل کر اس کے اعمال وافعال کو بھی بدل ڈالا ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے وہی کرتا ہے۔ اگر اس کے افکار وآراء اور تصوّرات ونظریات بے خدا ہوں تو پھر اس کے اعمال وافعال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہو جانا عالمِ انسان کا بہت بڑا حادثہ ہے جس نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے اب دنیا میں کوئی ایسی ہمہ گیر اخلاقی اور رُوحانی قوّت باقی نہیں رہی جو اندر سے انسانی اعمال کو ضبط میں لا کر صحیح راستہ پر ڈال سکے۔ یہی حقیقت ہے جو دورِ حاضر کے انسان کی تمام بدقسمتیوں اور پریشانیوں کا موجب ہے۔ مثلاً آزاد جنسیت کی وجہ سے اہلی زندگی کا بگاڑ، طفولیتی بے راہ روی، علم اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے ضبط ونظم کا فقدان، اقتصادی خوشحالی کے باوجود اطمینانِ قلب سے محرومی، ذہنی بیماریوں، خودکشیوں

اور جرموں کی روز افزوں تعداد، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی سازشیں اور ان سے پیدا ہونے والے سیاسی قتل اور سیاسی انقلابات، قومی اور بین الاقوامی معیارِ اخلاق کی پستی، میزائیلوں اور ایٹم بموں کے چڑھتے ہوئے انبار، عالمگیر جنگوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر سائنس باخدا ہو جائے تو یہ سب مفاسد اور مصائب ختم ہو جائیں اور آسمان کے نیچے ایک ارضی جنّت وجود میں آجائے۔

سائنس اور عشق کی گفتگو

اقبال نے اس مضمون کو سائنس اور عشق کی ایک گفتگو کی صورت میں بیان کیا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ میری نگاہ پوری کائنات کی رازدار ہے اور زمانہ میری کمند میں گرفتار ہے، میری آنکھیں اس مادّی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، مجھے آسمان سے اُس طرف کی دنیا یعنی عالم مابعد الطبعیات سے کوئی سروکار نہیں، میرے ساز سے سینکڑوں نغمے بلند ہوتے ہیں اور میں اپنے دریافت کیے ہوئے رازہائے سربستہ کو سربازار لے آتی ہوں تاکہ ہر شخص ان کو پرکھ سکے اور ان سے مستفید ہو سکے۔

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است　　گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند　　مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم　　بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

عشق جواب دیتا ہے کہ تمہاری افسوں گری سے سمندر شعلہ زار بنے ہوئے ہیں (مراد بحری جہازوں کی گولہ باری سے ہے) ہوا آگ برساتی ہے (مراد ہوائی جہازوں کی بم باری سے ہے) اور زہر آلود ہے (زہریلی گیس کی طرف اشارہ ہے۔ جب تک میرے ساتھ تیری دوستی تھی تو ایک نور تھی۔ مجھ سے الگ ہونے کی دیر تھی کہ تیرا نور آگ بن گیا۔ تو روحانیت کے خلوت خانہ میں پیدا ہوئی تھی (مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے تجھے خدا کی معرفت کی جستجو میں ایجاد کیا تھا) لیکن تو شیطان کے جال میں پھنس گئی (یعنی خدا کے تصوّر کو ترک کرنے اور باطل تصوّراتِ حقیقت کو اپنانے کی وجہ سے)۔ آ ہم دونوں مل کر اس خاکی کائنات کو گلستان بنائیں۔ آسمان کے

نیچے ایک ایسا بہشت بنائیں جو ہمیشہ قائم رہے۔ آ میرے دردِ دل سے ایک ذرّہ لے لے (یعنی خدا کے عقیدہ کو قبول کرلے) اور اس جہانِ پیر کو پھر جوان بنادے۔ ہم روزِ ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اور ایک ہی نغمہ (یعنی خدا کی محبّت کے نغمہ) کے زیر و بم ہیں:

زافسونِ تو دریا شعلہ زار است   ہوا آتش گداز و زہر دار است
جو بامن یار بودی نور بودی   بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی   ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز   تہِ گردوں بہشتِ جاوداں ساز
روزِ آفرینش ہمدم استیم   ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

جب انسان کے تمام اعمال کی قوّتِ محرکہ خدا کی محبّت ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا جو کام بھی خدا کی تسکین اور تشفی کے لیے نہ ہو گا محض بے سود ہو گا۔ سائنس اگر خدا سے بے تعلّق ہو گی تو وہ بیکار خیالات کا تماشہ خانہ ہو گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

علم کور از عشق برخوردار نیست   جز تماشہ خانۂ افکار نیست

بلکہ ایسی سائنس چونکہ سچّے تصوّرِ حقیقت سے کٹ جاتی ہے وہ لازماً کسی جھوٹے تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہو جاتی ہے۔ اس سے شیطانی قوّتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور انسان کے اصلی مقاصد کو نقصان پہنچتا ہے:

علم بے عشق از طاغوتیاں   علم با عشق از .لاہوتیاں

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر امین اللہ وشیر

اسلامی معیشت میں

سادگی اور کفایت شعاری کی اہمیّت

(یہ مقالہ خود انحصاری سیمینار منعقدہ لاہور میں پڑھا گیا)

اسلام دین فطرت ہے، وہ نیکی کی ایک عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے۔ اس کے اصول وضوابط انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں اور وہ انسان کی روحانی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی وکمال اور فلاح وبہبود کا علمبردار ہے۔ یہ چوں کہ ایک وسیع اور مکمل نظام حیات ہے لہٰذا انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ معیشت واقتصاد کا موضوع بھی ایک دینی موضوع ہے۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کی واضح ہدایات ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہیں اور مسلمان علماء ومفکرین نے ہمیشہ اس موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔

طلبِ رزق اور کسبِ حلال کی اسلامی تعلیمات میں بڑی اہمیّت ہے، قرآن مجید میں رزق کو اللہ کے فضل اور مال ودولت کو خیر کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ انسان اپنے معاشی وسائل کے حصول کے لیے مصروفِ عمل ہو۔

اسلامی معاشرے میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے، دریوزہ گری کرنے اور دوسروں کے ٹکڑوں پر پلتے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

سورۃ الجمعۃ میں ارشاد ہے:۔

"فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"

(پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو)

سورۃ المزمّل میں فرمایا:۔

"وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"

(اور کتنے دوسرے لوگ ہیں جو زمین میں پھرتے ہیں اللہ کا فضل تلاش کرتے)

اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ" (کنز العمال جلد ۲)

(حلال روزی کی تلاش فریضہ (عبادت) کے بعد بڑا فریضہ ہے)

ایک اور حدیث میں ہے:۔

"اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِی خَبَایَا الْاَرْضِ" (دارقطنی)

(رزق کو زمین کے پوشیدہ گوشوں میں تلاش کرو)

حضرت عمرؓ بن الخطاب کا قول ہے:

"لَا یَقْعُدْ اَحَدُکُمْ عَنْ طَلَبِ الرِّزْقِ" (احیاء العلوم جلد ۲)

(تم میں سے کوئی بھی طلبِ رزق کی جدوجہد کو چھوڑ کر بیکار نہ بیٹھا رہے)

قرآن مجید میں اس حقیقت کو بار بار واضح کیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ نے دنیا میں نعمتیں اسی لیے پیدا کی ہیں کہ اس کے بندے ان سے متمتع ہوں، ہماری شریعت میں نعمِ خداوندی سے اجتناب کر کے رہبانیت اختیار کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں، ارشادِ خداوندی ہے:

"وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" (سورۃ الحدید)

(اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا)

بلکہ قرآن مجید کا تو اعلان ہے کہ:

"هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" (البقرۃ)

(اللہ تعالےٰ) وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)

معلوم ہوا کہ طلب رزق، معاشرتی زندگی کا ایک اہم تقاضا ہے، جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں، البتہ اسلام نے طلب رزق کے لیے بعض اصول وضع کر دیئے ہیں جن سے ہٹ کر روزی کمانا ناجائز اور نامناسب ہے اور کسی مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر حرام کاموں میں اپنے آپ کو ملوث کرے۔

طلب رزق کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اسلام نے صرف حلال اور

طیب چیزوں کے حلال اور جائز ذرائع ہی سے حصول کی اجازت دی ہے، پاک اور ناپاک میں امتیاز کیا ہے اور جائز اور ناجائز طریقوں میں امتیاز کو روا رکھا ہے۔ بذاتِ خود حلال اور پاک چیز بھی اگر حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی تو اسکا استعمال ایک مسلمان کے لیے جائز نہ ہوگا۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً" (سورۃ المومنون)

(اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزوں میں سے اور عمل کرو نیک)

"وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلَالاً طَيِّباً وَّاتَّقُوا اللهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ۔" (المائدۃ)

(اور کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تم کو عطا کی ہیں حلال اور پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ کی ناراضی سے، جس پر تم ایمان لائے ہو)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالاً طَيِّباً وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" (البقرۃ)

(اے لوگو! کھاؤ جو کچھ زمین میں ہے حلال اور طیب۔ اور شیطان کے طریقوں کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔)

"كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللهِ" (البقرۃ)

(اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور پیو!)

اسلام لذائذ دنیا سے نہیں روکتا بشرطیکہ وہ جائز اور پاکیزہ ہوں، چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ" (المائدۃ)

(اے ایمان والو! اپنے اوپر ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہیں)

"وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ"

(اور (نبی علیہ السلام) ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال رکھتے ہیں اور خبیث

چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں) (الاعراف)

ان آیات میں رزقِ حلال وطیّب کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اہل ایمان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ جو چیز بھی معیشت کے لیے حاصل کی جائے وہ اپنی ذات میں بھی اور حصول کے اعتبار سے بھی پاک ہو اور اس میں کسی طرح کی بھی خباثت اور ناپاکی شامل نہ ہو

علامہ رشید رضا مصری نے اپنی تفسیر میں حلالاً طیباً کے سلسلے میں تحریر کیا ہے :۔

"پس جو شے ناحق لی گئی اور صحیح طریقہ کار سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ ربا، رشوت، قمار، ظلم، غصب، دھوکا، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی وہ حرام ہے، اس لیے کہ وہ طیّب نہیں۔ پس ہر خبیث شے حرام ہے خواہ وہ خُبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو اور خواہ اس کے اپنے اندر موجود ہو۔ جیسا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سڑ کر بو آجانا اور امراض جسمانی کا سبب بننا۔"

اسلام نے معیشت کے معاملے میں کن کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور کن کن امور سے اجتناب کی تلقین کی ہے، اس سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تحریر فرماتے ہیں :

قرآن مجید نے حصولِ دولت کے جن طریقوں کو ممنوع ٹھہرایا ہے وہ مختصراً یہ ہیں :

(۱) دوسرے کا مال اس کی رضا کے بغیر اور بلا عوض یا برضا اس طرح لینا کہ رضامندی کسی دباؤ یا دھوکے کا نتیجہ ہو (۲) رشوت (۳) غصب (۴) خیانت خواہ افراد کے مال میں ہو یا پبلک کے مال میں (۵) چوری اور ڈاکہ (۶) مالِ یتیم میں بے جا تصرف (۷) ناپ تول میں کمی بیشی (۸) فحش پھیلانے والے ذرائع کا کاروبار (۹) گانے بجانے کا پیشہ (۱۰) قحبہ گری اور زنا کی آمدنی (۱۱) شراب کی صنعت اور اس کی بیع اور اس کی نقل وحمل (۱۲) جوا اور تمام وہ طریقے جن سے لوگوں کا مال کچھ دوسرے لوگوں کی طرف منتقل ہونا محض بخت و اتفاق پر مبنی ہو (۱۳) بت گری، بت فروشی، اور بت خانوں کی خدمات، (۱۴) قسمت بتانے اور فال گری کا کاروبار (۱۵) سود خواہ اس کی شرح کم ہو یا زیادہ اور خواہ وہ شخصی ضروریات کے قرضوں پر ہو یا تجارتی و صنعتی اور زراعتی ضروریات کے قرضوں پر (معاشیاتِ اسلام صفحہ ۸۹)

کسب مال کے باطل طریقوں کی پوری تفصیل تو احادیث نبوی اور فقہ اسلامی کی کتب کے

متعلقہ ابواب میں دیکھی جاسکتی ہے، یہاں قرآن مجید کی بعض آیات اور احادیث نبوی کا بیان کردینا کافی ہوگا۔ جن سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ دولت صرف حلال اور جائز طریقوں سے حاصل کی جائے اور حرام و ناجائز طریقوں سے اجتناب کیا جائے۔

مختصر اکسبِ معاش میں اسلام یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ حاصل کردہ شے حلال ہو حرام نہ ہو، اور طیب ہو خبیث نہ ہو۔ جو شخص اللہ اور رسول کے مقرر کردہ احکام اور اصول کے تحت اپنے لیے وسائلِ معاش بہم پہنچائے تو بلاشبہ اس کی کمائی صالح معیشت میں شمار کی جائے گی۔ لیکن کسبِ معاش کے ساتھ ہی ساتھ اسلام نے دولت اور سرمایہ داری کے وہ تمام طریقے ممنوع قرار دیئے ہیں جن سے سرمایہ پھیلنے سے روکا جائے اور اس کو اس طرح جمع کرلیا جائے کہ معاشرے کے دوسرے افراد اس کے منافع سے متمتع نہ ہوسکیں۔ دراصل مال و دولت کے معاملے میں اسلام کا اپنا ایک خاص مقصد ہے جس کی طرف " كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ " (کہ مال تمہارے مالداروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے) میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ مضمون جسے قرآن مجید نے اس ایک مختصر مگر جامع فقرے میں بیان کردیا ہے اسلامی معاشیات کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی لیے اکتناز اور احتکار (غلے کو روکے رکھنا اور مصنوعی قلت پیدا کرنا) اسلامی نظامِ معیشت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں، کیونکہ وہ اس بات کا قائل نہیں کہ دولت تقسیم ہونے کے بجائے سمٹ کر خاص حلقوں یا مخصوص طبقوں تک محدود ہوجائے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

" وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ " (التوبۃ)

(اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دو!)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ۔ (ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنتی ہے)

اسلام بخل اور کنجوسی سے بھی منع کرتا ہے فرمایا:

"سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (آل عمران)

(جس مال میں انہوں نے بخل کیا ہے اسی کا طوق قیامت کے دن ان کے گلے میں ڈالا جائے گا)

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (سورۃ التغابن)

(اور جو کوئی دل کی تنگی اور نفس کی بخیلی سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں)

صرفِ دولت

اسلامی معاشی نظام میں ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ طلبِ رزق اور کسبِ مال کے لئے تگ و دو کرے اور اپنے لیے، اپنے اہل و عیال کے لیے دولت کمائے اور ان پر خرچ کرے۔ اسلام اس بات کو بھی مسلمانوں پر لازم قرار دیتا ہے کہ ان کے مال کا ایک حصہ معاشرے کے اجتماعی کاموں میں صرف کیا جائے اور ایسے افرادِ انسانی جو واقعۃً مستحق ہوں، ان کی امداد و اعانت ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی بیشمار آیات اور احادیث نبویؐ ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ"

(نیکی اس چیز کا نام نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلو۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان ایمان لائے اللہ پر، یوم آخرت پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور نبیوں پر، اور مال دے اللہ کی محبت میں، اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو اور خرچ کرے لوگوں کو غلامی سے گردنیں چھڑانے میں)

سورۃ الدھر میں ہے:

"وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا"
(اور وہ اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین اور یتیم اور قیدی کو)

سورۃ المعارج میں فرمایا:

"وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ"
(اور ان کے مالوں میں ایک مقرر شدہ حق (حصہ) ہے مدد مانگنے والوں اور محروم لوگوں کے لیے۔)

سورۃ البقرۃ میں ہے:

"وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ"
(اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں)۔

یہ تو فی سبیل اللہ صرف دولت کا حکم تھا۔ عام اصولِ معیشت کے اعتبار سے جب انسان کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ کمائے اور کھائے، پیئے اور پہنے، اور اپنی دنیوی زندگی کو سنوارنے کے لیے مال خرچ کرے، تو اب دیکھنا ہوگا کہ کس طرح خرچ کرے؟ کیا وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کا جس طرح چاہے خرچ کرنے کا مختار ہے یا اسکے لیے بھی کوئی حدود و قیود اس پر لازم قرار دی گئی ہیں؟

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے شریعت نے مال و دولت کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے، اسے اللہ کا فضل اور خیر قرار دیا ہے، بلکہ کسبِ حلال کو فرض گردانا ہے، اور اسے ایک اعلیٰ درجے کی عبادت اور فریضہ بتایا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مال و دولت کو ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جائے اس کو شہید کا لقب عطا کیا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اسلام اگرچہ دولت کمانے کے خلاف نہیں لیکن وہ اس رجحان کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے کہ انسان درہم و دینار کا غلام بن کر رہ جائے اور جب کبھی دولت اور اعلیٰ ملی و اجتماعی تقاضوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا مرحلہ آجائے تو وہ دولت کو ترجیح دے اور ملی تقاضوں کو نظر انداز کر دے۔ اسلام مادہ پرستی اور حرصِ دنیا کو پسند نہیں کرتا، چنانچہ ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بندۂ دینار اللہ کی رحمت سے محروم ہوا اور بندۂ درہم اللہ کی رحمت سے دور رہے"۔

صرف دولت کے بارے میں اسلام کا اصول اعتدال، میانہ روی اور سادگی کا ہے۔

اعتدال اور میانہ روی اسلامی نظامِ اخلاق کا ایک عظیم الشان باب ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو امت وسط (بیچ اور درمیان کی امت) کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچنے اور اعتدال اور میانہ روی کا دین ہے، لہٰذا یہ امت بھی اُمَّةً وَّسَطاً کہلائی۔

اعتدال کو اسلامی معاشرت کے ہر پہلو میں مستحسن اور پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ عبادات میں بھی غلو اور افراط سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متواتر روزہ رکھنے اور ہر وقت نوافل میں مشغول رہنے سے بھی منع فرمایا۔ اللہ تعالےٰ کو پکارنے کے لیے بیچ کی راہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ چال ڈھال میں بیچ کی چال کا حکم ہے۔ سخاوت اور فیاضی بہت عمدہ انسانی صفت ہے لیکن اس میں بے اعتدالی اور نمود و نمائش کی ممانعت کی گئی ہے۔

ایک حدیث نبوی کے الفاظ ہیں:

"مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِی الْغِنٰی، مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِی الْفَقْرِ، مَا اَحْسَنَ الْقَصْدُ فِی الْعِبَادَةِ" (کنز العمال)

(دولت مندی میں اعتدال کتنا عمدہ ہے۔ محتاجی میں اعتدال کتنا عمدہ ہے، عبادت میں اعتدال کتنا عمدہ ہے)

مسند امام احمدؒ میں روایت ہے:

مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِیْ مَعِیْشَتِهٖ"

(انسان کی دانشمندی یہ ہے کہ وہ معیشت میں میانہ روی اختیار کرے)

ایک اور حدیث میں فرمایا ہے۔

"مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ"

(جو میانہ روی پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر و محتاج نہیں ہوتا)

ذیل میں اسراف و تبذیر سے اجتناب اور اعتدال و میانہ روی کے قرآنی احکام درج کیے جاتے ہیں:

قرآن مجید میں اس بات کی سخت مذمت کی گئی ہے کہ انسان جائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو ناجائز کاموں میں اڑاتے، یا اپنے ہی عیش اور لطف و لذت پر اسے صرف کرتا چلا جائے اور اپنا معیار زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کے سوا اپنی دولت کا کوئی اور مصرف اس کی نگاہ میں نہ ہو، چنانچہ حکم ہے:

"كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ (الانعام : ۱۴۱)

(اور کھاؤ درخت کا پھل جب وہ پھل لائے اور کٹائی کے دن اس کا حق بھی ادا کرو لیکن بے جا خرچ نہ کرو، اللہ کو بے جا خرچ کرنے والے خوش نہیں آتے)

"وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ط إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ (الاعراف، ۳۱)

(کھاؤ اور پیو، مگر حد سے نہ گذرو، اللہ حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا)

"وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ـ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝ (بنی اسرائیل)

(اور اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔ اور فضول خرچی نہ کر۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔)

گویا جائز طریقے پر حاصل ہونے والی دولت پر تصرف کے بارے میں فرد کو بالکل کھلی چھوٹ نہیں دے دی گئی ہے بلکہ اس پر کچھ قانونی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں تاکہ کوئی فرد اپنی ملکیت میں کسی ایسے طریقے پر تصرف نہ کر سکے جو معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو، یا جس میں خود اس فرد کے دین و اخلاق کا نقصان ہو۔ اسلام میں کوئی شخص اپنی دولت کو فسق و فجور میں صرف نہیں کر سکتا اسراف اور عیش و عشرت پر اسلام پابندیاں عائد کرتا ہے، وہ اسے بھی جائز نہیں رکھتا کہ تم خود عیش کرو اور تمہارا ہمسایہ رات کو بھوکا سوئے۔ اسلام صرف مشروع اور معروف طریقے پر ہی دولت سے متمتع ہونے کا آدمی کو حق دیتا ہے۔

نقطۂ نظر

تصویر اور فوٹو کی شرعی حیثیت

از قلم : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، فاضل دیوبند

ماخوذ از 'جدید فقہی مسائل' (حصہ اوّل) مطبوعہ حرا پبلیکیشنز، لاہور

جہاں تک مجسّموں کی بات ہے وہ تو اسلام میں قطعاً ممنوع ہیں لیکن تصویر اور بالخصوص اس کی وہ صورت جو ہمارے زمانے میں ہے اور فوٹو گرافی کی شکل میں رائج ہے اس کی شرعی حیثیت قابلِ غور ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں احادیث، صحابہؓ کے آثار اور فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے زمانے میں اس کا تقابل بے حد بڑھ گیا ہے، اور بعض حالات میں اس کی حیثیت ناگزیر ضرورت کی ہوگئی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس کے احکام ذرا تفصیل سے لکھ دیے جائیں۔

تصویر کے سلسلہ میں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطلقاً ممنوع ہیں چاہے ذی روح کی ہوں یا غیر ذی روح کی۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس گھر میں تصویر ہو[1] حضرت جابرؓ سے بھی حضورؐ کا مطلقاً تصویر سے منع کرنا منقول ہے[2]

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی خلقت کے ساتھ مشابہت اختیار کریں[3] یعنی تصویر کی صورت خلقِ خداوندی کی نقل کریں۔ ظاہر ہے اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذی روح اور غیر ذی روح مخلوق میں کوئی فرق نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کی تصویر کھینچنا نادرست ہے ایک اور روایت میں اس کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جس میں تصویر کی ممانعت

---

[1] بخاری و مسلم
[2] سنن ترمذی
[3] بخاری و مسلم

کے پس منظر میں کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی طرح تخلیق کا کام کرنا چاہے، اسے چاہیئے' ایک جو یا کوئی سا دانہ ہی پیدا کرلے[۱] اس حدیث میں جو (شعیرہ) اور دانہ (حبہ) کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ ان چیزوں کی تصویر کشی بھی ممنوع ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی روح کی تصویریں بنانا ناجائز ہے اور غیر ذی روح کی بنائی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس نے ایک شخص کو جس کا پیشہ ہی مصوّری تھا غیر ذی روح تصویر بنانے کی اجازت دے دی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ مصوّروں کو قیامت کے دن اپنی تصویروں میں روح پھونکنے کو کہا جائے گا اور وہ نہ پھونک سکیں گے[۲] ظاہر ہے کہ روح پھونکنے کی بات ان تصویروں میں کہی جائے گی جو ذی روح کی ہوں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تصویریں ممنوع ہیں جن کا احترام کیا جائے، تصویروں کا اس طرح ہونا کہ ان کا احترام نہ کیا جائے، درست ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ان کے شہ نشین پر ایک پردہ تھا جس میں تصویریں بھی تھیں۔ حضورؐ نے اسے پھاڑ دیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس کے دو تکیے بنا دیے جس پر حضورؐ تشریف رکھا کرتے تھے[۳] اس حدیث کو ایک دوسری روایت سے بھی تقویت ملتی ہے جس میں آپؐ نے پردہ پھاڑنے کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ اللہ نے ہمیں پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا[۴] یہاں حضورؐ نے پردہ پھاڑنے کی علت تصویر کو نہیں قرار دیا ہے۔

مصوّر کپڑے سے تکیے بنا لینے کا واقعہ خود حضورؐ کی زبان سے بھی منقول ہے اور اس میں یہ ہے کہ خود حضرت جبرئیلؑ نے اس طرح تکیے بنانے کے مشورے دیئے تھے۔

اور ایسی حدیث بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجسّموں کی حرمت ہے نہ کہ ان تصویروں کی جو کپڑوں پر بنائے جائیں۔ حضرت ابو طلحہؓ اور سہل بن حنیفؓ اس کے راوی ہیں — ان کے الفاظ ہیں: " الا ماکان رقما فی ثوب " (وہ تصویر درست ہے جو کپڑے میں نقش ہو) — یہ حدیث صحیح اور قابلِ استدلال ہے۔ چنانچہ امام ترمذی اس حدیث

---

[۱] بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ رضؓ [۲] بخاری ومسلم عن ابن عباس

[۳] بخاری ومسلم عن عائشہ رضؓ [۴] ان اللہ لم یامرنا ان نکسو الحجارۃ والطین

کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "یہ حدیث حسن صحیح ہے" ھذا حدیث حسن صحیح [1]

اسی طرح تصویر کے سلسلہ میں صحابہ و تابعین کے بعض ایسے آثار بھی منقول ہیں جن سے ذی روح کی تصویر کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم ابن محمد کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے گھر میں بعض عجائب مخلوق کی تصویریں تھیں [2] امام ابو یوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی وساطت سے دو صحابہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور براء ابن عازبؓ سے نقل کیا ہے کہ ان کی انگوٹھی کے نگینوں میں دو شیر نیوں کی تصویریں تھیں [3] اس طرح کے اور بھی آثار حضرت عروہؓ، انس بن مالکؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہیں۔

فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں گو کہ عموماً تصویر کی مطلقاً حرمت منقول ہوئی ہے مگر ایسی عبارتیں بھی موجود ہیں جن سے فرش یا بستر وغیرہ میں تصویر کا جواز اور پردہ اور قابل احترام مواقع پر تصویر کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام محمدؒ لکھتے ہیں:

ما کان فیہ من تصاویر	مصوّر کپڑے بستر، فرش یا تکیوں
من بساط یبسط او فراش	کی طرح استعمال کیے جائیں تو کوئی
یفرش او وسادۃ فلا باس	مضائقہ نہیں۔ یہ پردہ اور ایسی
بذلک انما یکرہ من	چیزوں میں مکروہ ہے جسے کھڑا کیا
ذالک فی الستر وما ینصب	جائے یہی امام ابوحنیفہ اور ہمارے
نصبا وھو قول ابی حنیفۃ	عام فقہاء کی رائے ہے۔
والعامہ من فقہائنا [4]	

فتاویٰ عالمگیری میں بھی صرف ان ذی روح تصویروں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، جنہیں لٹکایا جائے۔ یوں مطلقاً تصویر کے بارے میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

ولا یجوز فی موضع — کسی جگہ ایسی چیز کو لٹکانا درست

---

[1] سنن ترمذی ج ۱ ص ۲۰۸ باب ماجاء فی الصورۃ [2] فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۲۶

[3] کتاب الآثار ص ۲۳۲ حدیث نمبر ۱۰۲۸ [4] مؤطا امام محمد ص ۳۸۰

شيئاً فيه صورة ذات	نہیں ہے جس میں ذی روح کی تصویر
روح ويجوز ان يعلق	ہے، غیر ذی روح کی تصویریں
ما فيه صورة غير ذات	لٹکائی جاسکتی ہیں۔

كذا في الظهيرية[1]۔

جو لوگ تصویر سے منع کرتے ہیں وہ اس کی ایک اہم وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ بسا اوقات شرک اور بت پرستی کا باعث بنتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بھی چیز جو شرک کا ذریعہ بنتی ہو اسلام اس کے معاملہ میں بہت غیور اور متحس ہے اور اس معاملہ میں ادنیٰ مداہنت گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ بڑا اہم سبب ہے اور یہ کہنا کہ یہ بات صرف مجسموں کی حد تک پائی جاتی ہے صحیح نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ گرونانک جی کی اور ہندوؤں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد مہاتما گاندھی جی کی تصویروں کی پرستار ہے اور اس پر اسی طرح پھول کی مالائیں اور جل نثار کرتی ہے جیسا کہ اپنے مشہور بھگوانوں پر۔

اس لیے راقم الحروف کے نزدیک تصویر سے متعلق احکام حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ذی روح کے مجسّمے بنانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے۔

۲۔ ایسی تصویریں بھی قطعی طور پر ناجائز ہیں جن کی کسی قوم میں پرستش اور عبادت کی جاتی ہو، جیسے گرونانک جی اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق کرشنا، رام جی وغیرہ اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح اور حضرت مریم کی تصویریں۔

۳۔ ذی روح کی تصویروں کو اس لیے بنانا کہ اس کو لٹکایا اور آویزاں کیا جائے یا مقام احترام میں رکھا جائے یا تصویر اس مقصد کے لیے نہ کھینچی گئی ہو مگر اس کا استعمال اسی طرح ہوا کرے، ہر دو صورتیں ناجائز ہیں۔

۴۔ عام تصویریں جن میں احترام یا عبادت اور پرستش مقصود نہ ہو، بھی ناجائز ہی ہیں جیسا کہ عام علماء ہند و پاک کا مسلک ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اجتہادی اور مختلف فیہ ہے اور سلف و خلف کا اس پر اتفاق نہیں ہے جیسا کہ اوپر ذکر کی ہوئی تفصیلات اور ہمارے زمانہ کے عام علماء عرب اور ہند و پاک میں بھی بعض ثقہ اور مستند علماء کرام

---

[1] فتاویٰ عالمگیری۔ ج ۴ ص ۱۱۴

کے تعامل سے واضح ہوتا ہے۔

۵۔ جہاں تصویر ایک ضرورت بن جائے مثلاً دفاعی مقاصد کے پیشِ نظر تصویر لی جائے۔ پولیس اسٹیشنوں، اشرار اور غنڈہ عناصر کی تصویریں محفوظ رکھی جائیں، ریلوے، بس اور مختلف محکموں میں شناخت کے لیے تصویر درکار ہو۔ پاسپورٹ اور حج کے لیے تصویر کھنچوانی ہو، یہ تمام صورتیں درست اور جائز ہیں۔

۶۔ جن فقہاء نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے انہوں نے بھی اس کی صراحت کردی ہے کہ اگر سر کٹا ہوا ہو یا ایسی تصویر ہو جس سے صورت کی شناخت نہ ہو سکے اس پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوگا اس لیے میڈیکل اور طبّی مقاصد کے لیے انسان کے جسم کے بعض حصّوں کی جو تصویریں لی جاتی ہیں اور جو اکثر اوقات جسم کے اندرونی حصّوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناقابلِ شناخت ہوتی ہیں، ان میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصّواب

بقیہ : ڈاکٹر طاہر سعید کے نام

یہ تھی جماعتِ اسلامی کی اصلی اور اساسی دعوت کہ ایک ایسا نظام جہاں صدیوں سے طاغوت نے انڈے بچّے دیے ہوں وہاں دعوت الی اللہ کے ذریعے ذہنی و فکری صفائی کے کام کو چھوڑ کر کسی انتخابی دوڑ یا وقتی اور ہنگامی سیاست میں کود کر ملوّث ہو جانا نہ صرف اپنے وقت کو ضائع کرنا بلکہ اسلامی انقلاب کے راستے میں اپنے ہاتھوں روڑے اٹکا کر اسی کارِ عبث کا خادم بننا ہے۔ مگر آہ ... کہ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے اسٹریچی ہال میں جماعتِ اسلامی کے بانی اور امیر نے جس قسم کی سیاسی رسہ کشی اور انتخابی سیاست کو اسلامی انقلاب کے راستے کا پتھر بتایا تھا آج وہی جماعت اُسی انتخابی سیاست کی سب سے بڑی چیمپئن بن چکی ہے اور نہ معلوم وہ کب تک اِس باطل اور ہنگامی سیاست کے منجدھار میں اٹھکیلیاں کرتی اور ذہنی اور فکری قلابازیاں کھاتی رہے گی۔

(جاری ہے)

لغات و اعراب قرآن (۲۲)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۷)

(آیات ، ۲۱-۲۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ الاعراب الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا

۲:۱۶:۲ الإعراب

زیرِ مطالعہ یہ دو آیات بنیادی طور پر چھ جملوں پر مشتمل ہیں جن میں سے بعض جملے صلہ کا کام دیتے ہیں اور صلہ موصول مل کر جملے کا ایک حصہ بنتا ہے۔ اور بعض جملے واو عاطفہ اور فاء عاطفہ کے ذریعے باہم ملائے گئے ہیں جس سے ایک مربوط لمبا جملہ بنتا ہے۔ تفصیل یوں ہے:

(۱) یاایھاالناس میں [یاایھا] حرف نداء ہے اور [الناسُ] منادٰی مفرد ہونے کے باعث مرفوع ہے۔

نحویوں کے نزدیک یہاں حرفِ ندا (یاایھا) یَا + اَیُّ + ھا کا مرکب ہے۔ میں اصل حرف ندا تو " یَا " ہی ہے۔ " اَیُّ " منادٰی (اور مبنی برضمہ) ہے۔ اور نحوی اسے (منادٰی مضاف کی طرح) محلاً منصوب شمار کرتے ہیں اور اس کے بعد " ھَا " (ضمیر نہیں بلکہ) حرفِ تنبیہ ہے (دیکھیے اوپر ۲ : ۱۶ : ۱ (۱) میں)

● تاہم عملاً اور فعلاً یہ صورت ہے کہ یہ سارا مرکب (یاایّھا) حرف نداء کا ہی کام دیتا ہے۔ یہ صرف معرف باللام منادٰی پر داخل ہوتا ہے۔ اور مذکر مؤنث کے لیے اس کے الگ الگ صیغے ہیں (ایّھا اور ایّتھا)۔ اس طرح یہاں لفظ (الناس) نحویوں کے نزدیک اصل منادٰی (اَیُّ) کا بدل یا اس کی صفت ہے۔ مگر ــــ فنّی باریکی برطرف ــــ سیدھی سی بات یہی ہے کہ یہی (الناس) ہی یہاں منادٰی ہے۔ اگر یہ بدل یا صفت ہوتا تو اس کا لانا لازمی نہ ہوتا۔ مگر اس کے لائے بغیر " منادٰی " کا مفہوم ہی نہیں بنتا۔ پس " یاایّھاالناسُ " کا نحوی ترجمہ "اے تو/وہ جو لوگ ہو" کی بجائے سیدھا بامحاورہ اردو ترجمہ ہوگا۔ " اے لوگو! " یا صرف " لوگو! "۔

(۲) اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم۔

[اُعْبُدُوا] فعل امر معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس میں " و " فاعل کی ضمیر مستتر (انتم) کا کام دے رہی ہے یعنی " تم عبادت کرو "۔ [رَبَّکُم] یہ مضاف (ربّ) اور مضاف الیہ (ضمیر مجرور " کُمْ ") مل کر فعل " اعبدوا " کا مفعول بہ ہے اور اس لیے منصوب ہے۔ اس میں علامتِ نصب " ربَّ " کی باء (ب) کی فتحہ (ـَ) ہے۔ [الَّذِی] اسم موصول ہے جو اپنے صلہ (مابعد آنے والے اگلے جملہ) کے ساتھ مل کر " ربَّکم " کی صفت بنے گا۔ اس طرح یہاں " الذی " دراصل منصوب ہی ہے۔ اگرچہ مبنی ہونے کے باعث اس میں کوئی علامتِ اعراب ظاہر نہیں ہے [خَلَقَکم] میں " خلَقَ " تو فعل ماضی معروف ہے، جس میں

ضمیر فاعل "هُوَ" مستتر ہے اور "کُمْ" یہاں ضمیر متصل منصوب اس فعل (خلق) کا مفعول بہ ہے اور یہ جملہ (خلقکم) الذی کا صلہ ہے۔ اس طرح "الذی خلقکم" (وہ جس نے کہ پیدا کیا تم کو) صلہ موصول مل کر "ربکم" کی صفت ہے۔ [والذین] میں "وَ" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور "الذین" اسم موصول معطوف ہے۔ اس کا عطف "خلقکم" کی ضمیر منصوب "کُمْ" پر ہے۔ یعنی بلحاظ معنی تقدیر عبارت (UNDERSTOOD) یوں ہے: "وَ (خلق) الذین" [من قبلکم] میں "مِنْ" حرف الجر، "قبلِ" ظرف (مجرور بوجہ "مِنْ") مضاف ہے اور "کُمْ" مضاف الیہ ضمیر مجرور ہے یعنی "تم سے پہلے" (ہوئے ہیں)۔ اور یہ مرکب جاری (من قبلکم) "الذین" کا صلہ ہے۔ اور یہ صلہ موصول مل کر (الذین من قبلکم) "خلقکم" کی ضمیر منصوب مفعول بہ (کُمْ) پر عطف ہے۔ یعنی "خلقکم و (خلق) الذین من قبلکم" (اس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو (بھی پیدا کیا) جو تم سے پہلے (ہوئے تھے)۔

(۳) لَعَلَّکُمْ تتقون: میں [لعلّ] حرف مشبہ بالفعل ہے جو "ترجی اور توقع" یعنی "شاید کہ"، "امید ہے کہ" کے معنی دیتا ہے۔ اور [کم] اس "لَعَلَّ" کا اسم (لہذا) منصوب ضمیر ہے اور [تتقون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے اور یہ (تتقون) ایک مکمل جملہ فعلیہ ہے جو "لعلکم" کی خبر کا کام دے رہا ہے۔ (یعنی امید ہے کہ تم بچو گے)۔ اور یہ پورا جملہ (لعلکم تتقون) یہاں ایک طرح سے فعل امر (اعبدوا) کے جواب میں "جواب شرط" کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی یہ ایک الگ مستقل جملہ ہے۔ اپنے سے سابقہ جملے (یاایھا الناس ..... قبلکم) کا کوئی نحوی جزء یا حصہ نہیں ہے۔

(۴) الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً :-

[الذی] اسم موصول ہے جو بعد میں آنے والے "صلہ" سمیت سابقہ آیت

کے " ربّکم " کی دوسری صفت (پہلی صفت " الذی خلقکم والذین من قبلکم " تھی جیساکہ اوپر (۲) میں بیان ہؤا ہے) یا بدل ہونے کے باعث محل نصب میں ہے ـــــ اور چاہیں تو یہاں (الذین سے) شروع ہونے والے (صلہ موصول) جملے کو ایک محذوف مبتدأ (ھُوَ) کی خبر (لہذا محلاً مرفوع) بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ [جَعَل] فعل ماضی ہے جس میں ضمیر فاعل " ھُوَ " مستتر ہے ۔ اور یہاں (جعل) سے اسم موصول (الذی) کا صلہ شروع ہوتا ہے ۔[لَکم] جار مجرور متعلق فعل (جعَل) ہے یعنی "بنایا/ پیدا کیا تمہارے لیے" ـــــ [الارض] فعل " جَعَل " کا مفعول اوّل اور [فراشًا] اس کا مفعول ثانی ہے ۔ اور یہ اس صورت میں ہے اگر جعل کے معنی " بنانا " مقرر لیے جائیں ۔ لیکن اگر فعل " جَعَل " بمعنیٰ " پیدا کرنا " لیا جائے تو پھر " الارضَ " اس کا مفعول اور " فراشا " اس (مفعول یعنی الارض) کا حال ہو سکتا ہے۔

اسی طرح [والسماءَ] کا " السماء " بھی (واو تو عاطفہ ہے) اسی " جعل " بمعنی بنانا کا مفعول اوّل اور [بناءً] مفعول ثانی ہے یعنی اس کا عطف " فراشا " پر ہے ـــــ اور یہاں بھی اگر " جعَل " بمعنی " خلَق " (پیدا کیا) لیا جائے تو پھر " السماء " کو مفعول اور " بناء " کو اس (مفعول) کا حال کہہ سکتے ہیں ـــــ تاہم اردو میں محاورے کی خاطر پہلے معنی (مفعول اوّل اور ثانی والے) کے ساتھ ترجمہ کرنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے (یعنی اس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت) ۔ کیونکہ دوسری ترکیب (حال والی) کے ساتھ ترجمہ (اس نے پیدا کیا تمہارے لیے زمین کو فرش ہوتے ہوئے اور آسمان کو چھت ہوتے ہوئے) بے محاورہ اور عجیب سا لگتا ہے ۔ اردو محاورے کے لحاظ سے " لکم " کا ترجمہ پہلے اور " جعل " کا ترجمہ سب سے آخر پر ہونا چاہیئے (یعنی " جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ") تاہم بیشتر مترجمین نے کلمات کی عربی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے " جعل " کا ترجمہ شروع میں کر دیا ہے ۔ " جس نے بنایا ...... " ۔ بعض مترجمین نے " کو " کی بجائے " زمین

کا فرش" اور "آسمان کی چھت" (بنائی) سے ترجمہ کیا ہے جو عربی ترکیب عبارت سے بعید ہے۔ اگرچہ مفہوم و محاورہ کے لحاظ سے غلط نہیں ہے۔ اسی طرح بعض حضرات نے "فراشا" اور "بناء" کی تنکیر (نکرہ ہونا) کا لحاظ رکھتے ہوئے "ایک فرش" اور "ایک چھت" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے جو زیادہ بہتر ہے۔

(۵) وانزل من السماء ماءً:۔

[وَ] عاطفہ بمعنی "اور" ہے اور [انزل] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس میں ضمیر فاعل "ھو" مستتر ہے اور یہ فعل (انزل) سابقہ فعل "جعل" پر عطف ہے یعنی "بنایا .... اور اتارا ....." [مِنَ السماءِ] جارّ (مِنْ) اور مجرور (السماءِ) مل کر فعل "انزَلَ" سے متعلق ہیں [یعنی اتارا۔ کہاں سے؟ اور جواب ہے "آسمان سے"] —— اس کے بعد [ماءً] فعل "انزل" کا مفعول بہ (لھذا) منصوب ہے جس کی علامت نصب آخری "ء" کی تنوین نصب (ـً) ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ پر عطف ہے

(۶) فَاَخْرَجَ بہ من الثمراتِ رزقًا لکم:

[فَاَخْرَجَ] میں فاء (فَ) عاطفہ ہے جس کا ترجمہ یہاں "پس یا چنانچہ" سے ہو سکتا ہے اور "اَخْرَجَ" سابقہ (حصۂ آیت) کے فعل "اَنْزَلَ" پر عطف ہے۔ یعنی "اتارا پس نکالا" [بِہٖ] جار (بِ) اور ضمیر متصل مجرور (ہ) مل کر فعل "اَخْرَجَ" سے متعلق ہیں اور یہاں یہ (بِ) سببیہ ہے یعنی "نکالا اس کے ذریعے سے یا اس کے سبب سے" اور ضمیر مجرور (ہ) کا مرجع "ماءً" ہے (دیکھئے مندرجہ بالا ۵) یعنی "اس پانی کے ذریعے نکالا" [من الثمرات] یہ جار (مِنْ) اور مجرور (الثمرات) مل کر فعل "اخرج" کے مفعول کی جگہ لے رہا ہے۔ اس لیے اسے محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ گویا دراصل "اخرج الثمراتِ" (اس نے پھل نکالے) تھا پھر "الثمرات" پر "مِنْ" لگا —— اب اگر اس "مِنْ" کو تبعیض کا مانیں تو ترجمہ ہوگا "پھلوں میں سے بعض" اور اگر "مِنْ" کو بیانیہ سمجھا جائے تو ترجمہ ہوگا "قسم قسم کے پھل" یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین نے "مِن" کی تبعیض کی بناء پر

"من الثمرات" کا ترجمہ "کچھ پھل" کیا ہے۔ اور بعض نے "مِن" کو بیانیہ سمجھتے ہوئے "انواع و اقسام کے پھل" ترجمہ کیا ہے۔ اور اکثر مترجمین نے اس "مِنْ" کو نظر انداز کرتے ہوئے "من الثمرات" کا ترجمہ صرف "پھل" یا "میوے" کر دیا ہے۔ یہ محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے تو درست ہے۔ تاہم "مِن" کو شامل کرنے والا ترجمہ بہتر قرار دیا جا سکتا ہے۔

[رِزْقًا] یہ فعل "اخرج" کا مفعول لہ ہے یعنی "برائے رزق"، "روزی کے لیے"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے (رزقًا کو) فعل "اخرَجَ" کا مفعول بہ مانیں اور "من الثمرات" کو اس کا بیان یا وضاحت سمجھ لیں، تو ترجمہ ہوگا "اس نے نکالا کچھ رزق از قسم میوہ جات"۔ اردو مترجمین میں سے بعض نے مفعول بہ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "کھانے کو، غذا کو" (یعنی کے طور پر)۔ جب کہ بعض نے مفعول بہ سمجھ کر "نکالا رزق، نکالا کھانا" سے ترجمہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں مفعول لہٗ والی ترکیب کے ساتھ ترجمہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ [لَكُمْ] جار مجرور (لِ + كُمْ) ایک طرح سے "رِزْقًا" (نکرہ موصوفہ) کی صفت کا کام بھی دے سکتا ہے یعنی "وہ رزق جو تمہارے لیے ہے"۔ جن حضرات نے "رِزْقًا" کا ترجمہ مفعول بہ سمجھ کر "رزق یا کھانا" کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مفعول لہ سمجھ کر ترجمہ "(رزق/روزی) کھانے کے لیے" کے ساتھ ہی "لکم" کا ترجمہ بھی "تمہارے لیے" کرنے سے پورا ترجمہ بنتا ہے "کھانے کے لیے تمہارے لئے"۔ اس کی اردو محاورے میں گنجائش نہیں۔ اس لیے انہوں نے "رِزْقًا" کو مفعول بہ بنا کر ترجمہ کر دیا "کھانا تمہارے لیے"۔ اور بعض نے "لکم" کا ترجمہ نظر انداز کرتے ہوئے صرف "تمہارے کھانے کو" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ یعنی مفعول لہ ہی سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ یہ جملہ بھی بذریعہ "فاء" سابقہ جملہ (۲۵) پر عطف ہے۔

(۷) فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ:

[فَلَا تَجْعَلُوا] میں ابتدائی فاء (فَ) یہاں عاطفہ مگر تعلیل (وجہ بتانا) کے معنوں میں ہے۔ اس کا اردو مفہوم "پس اس بناء پر" یا لھذا (اس لیے)

بنتا ہے۔ " لا تجعلوا " فعل نہی معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس میں " لائے نہی " کے باعث مضارع مجزوم ہو کر اس کا آخری " ن " گر گیا ہے۔ اور اس میں ضمیر فاعلین " انتم " مستتر ہے جس کی علامت " تجعلوا " کی " واو " ہے۔ [لِلّٰہ] جار مجرور مل کر فعل " لا تجعلوا " کے مفعول ثانی کی جگہ لے رہا ہے۔ اور [اندادًا] اس کا مفعول اول ہے۔ گویا تقدیر (اصل) عبارت یوں تھی " فلا تجعلوا اندادًا للہ " ۔ اور " لِلّٰہ " کا ترجمہ " اللہ کے لیے " کی بجائے " اللہ کا " بھی ہو سکتا ہے اس لیے بعض حضرات نے " لا تجعلوا للہ اندادًا " کا ترجمہ " نہ ٹھہراؤ تم اللہ کے ہم سر " یا " تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ " سے کیا ہے۔ اور یہ الفاظ سے قریب تر ہونے کے باعث بہت درست ترجمہ ہے۔ بعض نے یہاں " لا تجعلوا " کا ایک (پہلا) مفعول محذوف مان کر ۔ اور " اندادًا " کو مفعول ثانی سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ گویا تقدیر (اصل) عبارت کچھ یوں بنائی ہے ۔ " لا تجعلوا ۔ " احدًا " یا " مخلوقًا " ۔ اندادًا للہ " (ویسے چونکہ " اندادا " جمع ہے اس لیے محذوف مفعول اول " احدا " یا اس کی بجائے " مِنْ احدٍ " (کوئی بھی) یا " الھتکم " (اپنے معبودوں کو) سمجھا جا سکتا ہے) اس طرح ترجمہ ہوگا " کسی کو " یا " کوئی " نہ بناؤ اللہ کے ہم پلہ، ہم سر، برابر والے " کے مقابل " ۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے مترجمین نے ان الفاظ (" کسی کو " اور " کوئی ") کے اضافہ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ورنہ آیت میں تو اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ یہ محذوف مفعول کا ہی ترجمہ ہو سکتا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے۔ اگرچہ اصل (عبارت) پر ایک اضافہ ہے۔ اور اس اضافہ کے بغیر والا ترجمہ (تم اللہ کے ہمسر نہ بناؤ) زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے [وَ] اس " واو " کو یہاں عاطفہ (بمعنی " اور ") بھی کہہ سکتے ہیں اور حالیہ (بمعنی " حالانکہ ") بھی۔ اور اس کے بعد [اَنْتُمْ] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے (اسی لیے مرفوع ضمیر لائی گئی ہے)۔ [تَعْلَمُوْنَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعلین " انتم " ۔ یعنی صیغہ جمع مذکر

حاضر ہے اور یہ پورا جملہ فعلیہ (تعلمون) "انتم" (مبتدا والا) کی خبر ہے پھر یہ پورا جملہ اسمیہ ہوکر (انتم تعلمون) حال ہونے کی بنا پر (اگر "واو" کو حالیہ سمجھا جائے تو) محل نصب میں ہے۔ اسی لیے اردو کے بعض مترجمین نے اس (وانتم تعلمون) کا ترجمہ "جان بوجھ کر" یا "جانتے بوجھتے ہوئے" سے کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے "واو" کو عاطفہ سمجھ کر سیدھا ترجمہ "اور تم جانتے ہو" سے بھی کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں "واو" کو حالیہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

۲ : ۱۶ : ۳ الرسم

ان دو (زیر مطالعہ) آیات کے قریباً تمام کلمات کی املاء معتاد (عام عربی املاء) اور رسم عثمانی ایک جیسا ہی ہے۔ البتہ صرف تین کلمات "یاایھا"، "فراشاً" اور "الثمرات" کا رسم قابل ذکر ہے۔

(۱) حرف نداء "یاایھا" کو ہمیشہ "یایھا" لکھا جاتا ہے۔ یعنی شروع کے "یا" کو بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے پھر اس پر علامت ضبط ڈال کر اس کا تلفظ "یا" ہی رہتا ہے۔ اور اس "ی" کو "ایھا" کے ابتدائی ہمزہ (بصورت الف) کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے۔ یعنی "یایّھا" کی صورت میں۔ اسے الگ الگ "یا ایھا" لکھنا غلط ہے۔ مگر ترکی اور ایران کے مصاحف میں یہ غلطی عام ہے۔ اور اس (کلمۂ ندا) کی عام عربی املاء بھی یہی (یایھا) ہے جو عربی املاء پر رسم عثمانی کے اثرات کا ایک مظہر ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسم عثمانی کے مطابق حرف ندا "یا" ہر جگہ بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے (چاہے ساتھ "ایھا" ہو یا نہ ہو) مثلاً قرآن مجید میں "یموسی" اور "یاھل الکتاب" ہی لکھا جاتا ہے اگرچہ عام عربی املاء میں اسے "یا موسیٰ" اور "یااھل الکتاب" لکھا جاتا ہے۔

(۲) کلمہ "الثمرات" کے بارے میں علمائے رسم کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں ـــ یہاں اور ہر جگہ ـــ بحذف الف بعد الراء "لکھا جاتا ہے یعنی بصورت

" الثمرت " ۔ پھر بذریعہ ضبط اس محذوف الف کو تلفظ میں لایا جاتا ہے ۔ یعنی یہ الف (بعد الراء) لکھا نہیں جاتا مگر پڑھا ضرور جاتا ہے ۔ ترکی اور ایران کے مصاحف میں اسے باثبات الف لکھنے کی غلطی عام ہے ۔

(۳) کلمہ " فراشا " کے رسم عثمانی میں اختلاف ہے ۔ ابوداؤد سلیمان بن نجاح کی تصریح کی بناء پر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے بحذف الف بعد الراء لکھا جاتا ہے یعنی " فرشًا " کی صورت میں ۔ پھر پڑھنے کے لیے اس محذوف الف کو ضبط کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے ۔ لیبیا والے الدانی (م ۴۴۴ھ) کی عدم تصریح کی بناء پر اسے باثبات الف بعد الراء لکھتے ہیں یعنی " فراشا " اور یہی اس کی املاء معتاد بھی ہے ۔ الدانی نے المقنع میں اور الشاطبی نے (العقیلہ میں) اس لفظ کے محذوف الالف ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔ تمام مشرقی ممالک ۔ ترکی، ایران، برصغیر چین وغیرہ کے مصاحف میں بھی اسے باثباتِ الف (فراشا) ہی لکھا جاتا ہے مگر ان کے سامنے اہلِ لیبیا والی وجہ نہیں بلکہ غالباً تساہل یا عام عربی املاء کے اتباع میں یہ رواج ہوگیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ الدانی اور الشاطبی کی خاموشی ہی اس کا سبب بنی ہو ۔ کیونکہ ابوداؤد کی کتاب " التنزیل " (جو ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی) کا چرچا عرب اور افریقی ملکوں میں (بالواسطہ ہی سہی مگر) عام ہے جب کہ مشرقی ممالک میں زیادہ تر الدانی اور الشاطبی ہی متعارف ہیں ۔

۲ : ۱۶ : ۴ الضبط

زیرِ مطالعہ دو آیات میں کلمات کے ضبط کا اختلاف مندرجہ ذیل نمونوں سے سمجھا جاسکتا ہے :-

يَآيُّهَا ، يَآأَيُّهَا / النَّاسُ ، النَّاسُ ، ٱلنَّاسُ ، ٱلنَّاسُ / اعْبُدُوا ، اعْبُدُوا ، ٱعْبُدُوا ، ٱعْبُدُوْا

رَبَّكُم / اَلَّذِیْ ، الّذی ، اَلَّذِی ، اَلّذِی / خَلَقَكُمْ

خَلَقَكُمْ / وَالَّذِیْنَ ، الَّذِینَ ، اَلَّذِینَ ، اَلَّذِینَ

مِنْ ، مِن ، مِن / قَبْلِكُمْ ، قَبْلِكُمْ (علامت قلقلہ کے ساتھ)

قَبْلِكُمْ / لَعَلَّكُمْ / تَتَّقُوْنَ ، تَتَّقُونَ ، تَتَّقُونَ /

اَلَّذِیْ (مثل سابق) / جَعَلَ لَكُم / الْاَرْضَ ، اَلْاَرْضَ ،

اَلْاَرْضَ / فِرَاشاً ، فِراشاً ، فِرَاشاً ، فِرَاشاً (بحذف الف) /

وَّالسَّمَآءَ ، وَالسَّمَآءَ ، والسَّمَآءَ ، وَالسَّمَآءَ / بِنَآءً ، بِنَآءً ،

بِنَآءً / وَّاَنْزَلَ ، وَاَنزَلَ ، وَأَنزَلَ ، وَآنزَلَ / مِنَ ، مِنَ /

السَّمَآءِ (مثل سابق) / مَآءً ، مَآءً ، مَآءً / فَاَخْرَجَ ،

فَأَخْرَجَ ، فَاَخْرَجَ / بِهٖ ، بِهِ ، بِهٖ ، بِهٖ /

مِنَ ، مِنَ / الثَّمَرَاتِ ، الثَّمَرَاتِ ، اَلثَّمَرَاتِ /

رِزْقاً لَّكُمْ ، رِزْقاً لَّكُمْ / فَلَا تَجْعَلُوْا ، فَلَا تَجْعَلُوا ،

فَلَا تَجْعَلُوْا ، فَلَا تَجْعَلُوْا / لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ

اَنْدَادًا ، اَنْدادًا ، أَنْدَادًا / وَّاَنْتُمْ ، وَأَنْتُمْ ،

وَاَنْتُمْ / تَعْلَمُوْنَ ، تَعْلَمُونَ ، تَعْلَمُونَ ۔

ملحوظ : اختلافِ ضبط کی مندرجہ بالا صورتوں میں ایک دو چیزیں خصوصاً قابلِ

غور ہیں۔

(۱) تنوین کے ملفوظی نون ساکن کے بعد اگر "یرملون" میں سے کوئی حرف آجائے تو حرفِ منوّن کو تنوین کی ایک حرکت (ـً، ـٍ یا ـٌ) کے ساتھ اس (حرفِ یرملون) میں مدغم کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اس حرفِ مدغم فیہ پر علامتِ تشدید ڈالی جاتی ہے اس کی مثال آپ نے اوپر "رِزْقًا لَّكُمْ" میں دیکھی ہے۔ اگر ایسے حرف منوّن کے بعد "و" یا "ی" ہو تو اس سے ادغام میں غنہ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ صرف برصغیر میں ایسی "و" یا "ی" پر علامتِ تشدید ڈالی جاتی ہے۔ جس کی مثالیں آپ نے اوپر "فِرَاشًا وَّ"، "بِنَاءً وَّ" اور "اَنْدَادًا وَّ" میں دیکھی ہیں۔ البتہ اس میں غنہ پڑھنے کا طریقہ طالب علم کو زبانی سمجھا دیا جاتا ہے (کہ تنوین یا نون ساکن کے بعد "و" یا "ی" ہو تو "نون" غنہ کے ساتھ پڑھنا چاہیئے)۔ پاکستان کے صرف تجویدی قرآن میں اس قسم کی تنوین کے لیے غنہ کی ایک خاص علامت مقرر کی گئی ہے یعنی ـًـ، ـٍـ یا ـٌـ کی صورت میں۔ عجیب بات ہے کہ عرب اور افریقی ممالک ۔ بلکہ ایران اور ترکی میں بھی۔ اس قسم کی (تنوین کے بعد آنے والی) "و" یا "ی" پر علامت تشدید نہیں ڈالی جاتی جیسا کہ مندرجہ بالا الفاظ میں آپ نے دیکھا۔ البتہ اس تنوین کو تنوینِ اخفاء (ـًـ، ـٍـ، ـٌـ) کی شکل دے دی جاتی ہے غالباً وہاں بھی غنہ کا قاعدہ زبانی ہی بتایا جاتا ہوگا کیونکہ یہ تجوید کا ایک اہم قاعدہ ہے اسے قراءت میں نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسری قابلِ توجہ بات ہائے کنایہ کا ضبط ہے۔ برصغیر میں یہ ضبط بصورت کسرہ (ـِ) حرکتِ اشباع یعنی کھڑی زیر (ـٖ) سے اور بصورت ضمہ (ـُ) ضمہ معکوس (ـٗ) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً "بِهٖ" اور "لَهٗ" میں ـــ تمام عرب اور افریقی ملکوں میں اس مقصد کے لیے متعلقہ "ھا" پر صرف کسرہ (ـِ) اور ضمہ (ـُ) ڈال کر بصورت کسرہ ساتھ ایک باریک سی "ی" یا "ے" سطر سے نیچے یا سطر سے اوپر لکھتے ہیں اور بصورت ضمہ (ـُ) ساتھ ایک باریک سی

"ہ" اسی طرح (سطر سے اوپر یا نیچے) ڈال دیتے ہیں یہ "ہ" یا "ی" قلمی دور میں "سرخ سیاہی" سے لکھی جاتی تھی اب دورِ طباعت میں اسے کتابت کے عام قلم کی بجائے باریک قلم سے لکھا جاتا ہے یعنی "بِہٖ" اور "لَہٗ" کی صورت میں۔ اس کا نمونہ آیتِ زیرِ مطالعہ کے کلمہ "بہ" میں دیکھئے۔

(۳) عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں نون ساکنہ مخفاۃ (اخفاء کے ساتھ پڑھے جانے والے ساکن نون۔ یعنی جس کے بعد حرف حلقی نہ ہو) پر علامت سکون ڈالی ہی نہیں جاتی جیسے آپ نے اوپر "انتم"، "انـدادًا"، "من" اور "انزل" میں ملاحظہ کیا ہوگا بعض مصاحف (مثلاً تجویدی قرآن اور مصحف حلبی) میں اس قسم کے اخفاء کے لیے "نون" پر خاص قسم کی علامتِ سکون ڈالی گئی ہے۔

(۴) صرف افریقی ممالک میں "ف" کو "ڤ"، "ق" کو "ڧ" لکھا جاتا ہے اور کلمہ کے آخر پر آنے والے "ن"، "ی"، "ف" اور "ق" کو نقطوں سے خالی رکھا جاتا ہے اس کی مثالیں آپ نے اوپر "من"، "تتقون"، "تعلمون" اور "الـذیں" میں ملاحظہ کی ہیں۔ ایسی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں۔

(۴) بعض افریقی ممالک کے مصاحف میں "لِلّٰہِ" کو ہر جگہ اس طرح لکھتے ہیں کہ صرف ابتدائی لام اور آخری ھا کی کسرہ (ـِ) لکھ دی جاتی ہے اور درمیانی "لام" کو ہر طرح کی حرکت سے خالی رکھا جاتا ہے یعنی صرف "لـلہِ" لکھتے ہیں اور غانا میں تو اسے لکھتے بھی خاص انداز میں ہیں یعنی بصورت "لـلہ" (جیسے ہمارے ہاں اردو فارسی میں "اللہ یار" میں لکھتے ہیں)۔ ویسے وَاللّٰہُ، بِاللّٰہِ وغیرہ میں وہ درمیانی لام پر تشدید اور حرکت ڈالتے ہیں صرف بصورت "لـلہِ" ایسا نہیں کرتے۔ پڑھنے کا طریقہ غالباً استاد سے زبانی سیکھا جاتا ہوگا۔

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۲)
ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

(گزشتہ سے پیوستہ)

ان جمہوری طریقوں اور انتخابات نے نفاذِ اسلام کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں اُن میں سے چند ایک یہ ہیں :-

اوّلاً یہ کہ ہمارے عوام کی اکثریت عقل و فہم سے عاری اور ہوش و خرد سے خالی ہے۔ ایسے لوگ زندگی کے فیصلے اعلیٰ ترین اقدار کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ وقتی اور عارضی آرام و آسائش کو مدِّ نظر رکھ کر مجرّد جذبات سے کرتے ہیں۔ اور یہ کڑوی حقیقت ہمارے لیے چنداں باعثِ تعجّب نہیں کیونکہ مسلسل دو صدیوں تک انگریز کے سامنے دست بستہ قیام و حضور اور خداوندِ فرنگی کی بدترین اور ذلیل ترین بندگی اور غلامی نے گھٹیا پن اور چھچھورپن کے نہایت زود اثر انجکشن دے کر ہمارے اندر معقولیت، سنجیدگی، مضبوط قوتِ فیصلہ، جواں ہمتی، جذبۂ قربانی، مستقل مزاجی اور شعورِ اسلامی کا جنازہ نکالا ہے۔ اسی قوم کے لوگ ایک عرصۂ دراز تک فرنگی عدالتوں کے جج، فرنگی سینماؤں کے مینیجر اور فرنگی شراب خانوں کے نگہبان رہے ہیں۔ اور آج تک یہ "مقامِ شرم" اُن کے لیے "مقامِ فخر و ناز" ہے۔ معاشرتی اور سیاسی جرائم کی جتنی قسمیں کافر قوموں میں پائی جاتی ہیں، ہماری قوم "لفظِ اسلامی" کے ایک ارزاں اور سستے لائسنس کے ساتھ اُنہی جرائم کا ارتکاب کرنے میں کافروں سے بھی زیادہ بے باک ہے۔ ظاہر ہے ایسی فضا میں اگر انتخابات اور الیکشن کی رو چلے تو ایک اسلامی سمگلر، ایک اسلامی ڈاکو، ایک اسلامی چور اور ایک اسلامی میوزک پلیئر (MUSIC PLAYER) ایک عالمِ دین کو ووٹ دے کر اپنے بنے بنائے کاروبار کا خود دشمن تو کبھی بھی نہیں بن سکتا۔ وہ تو ایک ایسے شخص کو منتخب کرکے

اسمبلی میں بھیجے گا جو اُسے سمگلنگ اور ڈاکے اور چوری کا لائسنس فراہم کر سکے اور اگر بہ دوڑان غلط کاریوں میں کبھی پکڑا گیا تو وہی ایم پی اے یا ایم این اے اس قومی خیانت میں اُس کا باتونی اور چرب زبان وکیل بن سکے۔ چنانچہ اس ملک کی اسمبلیوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑایئے تو آپ کو رحمت کے فرشتوں کے فقدان اور شرارت کے شیاطین کی فراوانی ہی فراوانی نظر آئے گی جو انسان کے روپ میں جنگلی درندوں کا رول ادا کر رہے ہیں، جنہیں قدرت نے انسانوں کو لوٹنا تو درکنار درندگی اور خونخواری میں شیطانوں کے کان کترنے کا بھی ایک عظیم الشان ملکہ عطا کر رکھا ہے۔

ایک ایسے جمہوری طریقِ کار اور انتخابی سیاست میں اس معجزہ کے وقوع و امکان کی توقع آخر کون رکھ سکتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جہاں اسّی فیصد لوگ دعوت الی اللہ کی اصلی رُوح سے مدّتوں بیگانہ رہنے کی وجہ سے صرف نسلی و موروثی یا کلمہ گوئی کی حد تک مسلمان ہوں وہاں اُن کے ووٹوں سے پکے اور سچے مسلمان ابھر کر کبھی اسمبلیوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہوتا تو پھر اس ملک میں جہاں کلمہ گو مسلمانوں کا تانتا لگا رہتا ہے ایک سیکولر باپ کی سیکولر بیٹی منتخب ہو کر ایک "منکر" کی شکل میں کیوں مسندِ اقتدار پر متمکن ہو گئی؟ کیا اُن کے منشور میں صاف لکھا ہوا نہیں کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور کیا قرآن کے ایک ایک صفحے پر اس حقیقت کو کھول کر بیان نہیں کیا گیا ہے کہ اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کے تصوّر کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام کی طاقت کا نظریہ رکھنا بدترین قسم کا شرک ہے۔

پس یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو لاٹھی لے کر عقل و دانش کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہو کہ اسی معاشرہ میں دعوت قرآنی کو ثانوی (SECONDARY) حیثیت دے کر نفاذِ اسلام کے نعروں سے عوام کے ووٹ حاصل کرنا گھوڑا گاڑی کو گھوڑے سے آگے (TO PUT THE CART BEFORE THE HORSE) باندھنے کے مترادف ہے، جس معاشرہ میں نظریۂ توحید سے لوگوں کے دماغوں کو مسحور اور دلوں کو مسرور نہ کیا گیا ہو، جہاں ایک نظامِ باطل کی خرابی اُن پر واضح

نہ کی گئی ہو، جو اسلام کی اصلی روح سے قطعی نابلد اور قرآن و سنّت کی بنیادی تعلیمات سے بالکل ناآشنا ہوں وہاں نظامِ باطل کی سرکوبی اور نظامِ حق کی کامرانی کے لیے اُن سے ووٹ حاصل کرنے کی توقع رکھنا عقل و منطق کی کونسی عدالت کی رُو سے درست ہے۔

اِس ساری بحث کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ جماعتِ اسلامی سمیت اپنے ملک کی اسلامی سیاسی جماعتوں پر نگاہ دوڑایئے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ یہ جماعتیں جن کا اصل ہدف قرآن و سنّت کی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلانا اور عوام کی ذہنی اور فکری صفائی کرنا تھا، اُلٹا دین کی حقیقت سے غافل و ناآشنا عوام سے ووٹ حاصل کرنے اور اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ذریعے نفاذِ دین کے اُسی اَن ہونے معجزے کا انتظار کر رہی ہیں جس کا میں ابھی ذکر کر آیا ہوں۔ چنانچہ الفاظ قلم بند کرتے ہوئے میرا ذہن اچانک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ جہاں جماعتِ اسلامی کے سابق امیر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم مغفور نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے عنوان سے ایک بڑی فکر انگیز اور ایمان افروز تقریر کی تھی، جس میں انہوں نے نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں فرمایا:

"جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو اُن کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا، جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہو، مگر اپنے نظریات اور طریقِ کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے

معنی یہ ہیں کہ ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر — کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیاد بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا۔ تو آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟۔ اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں۔ جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی، بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہوگی۔"

دیکھا آپ نے کیسے زوردار لہجے میں سیّد مودودی مرحوم جمہوری طریق کار یا انتخابی سیاست کو ایک شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اس کی بھرپور نفی کر رہے ہیں۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

(باقی صـ۴۸ پر)

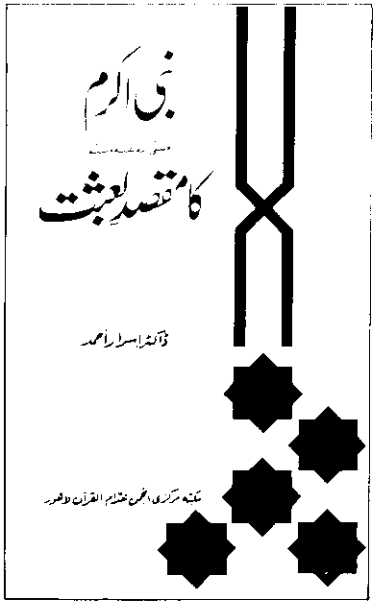

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

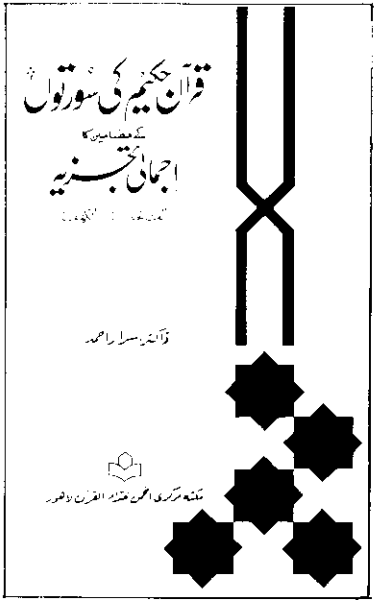

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

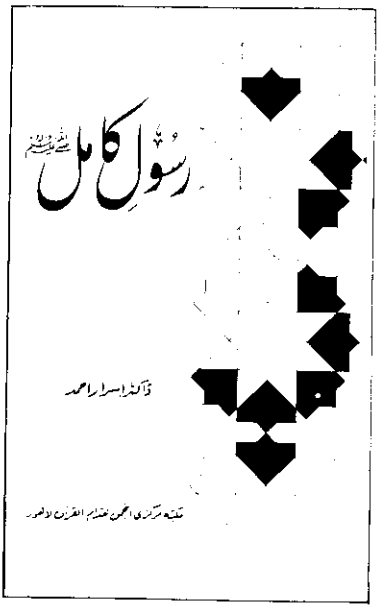

اشاعت خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

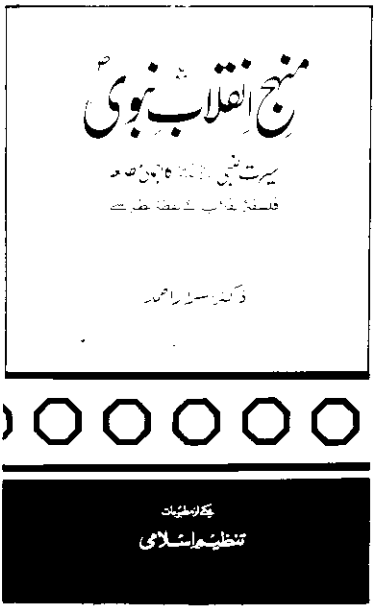

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

MARCH Regd No. L. 5193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL 10
NO. 3

طالبانِ قرآن کے لیے خوش خبری

ان شاء اللہ العزیز ـــــ اس سال ماہ رمضان المبارک میں

ڈاکٹر اسرار احمد

نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن

کراچی میں انجمن کی زیر تعمیر قرآن اکیڈمی

واقع خیابانِ راحت، درخشاں، مرحلہ ۶ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی

میں مکمل کریں گے ـــــ اور ـــــ اس کے ساتھ اسی مقام پر

ہفتہ ۱۶ مارچ تا ہفتہ ۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء

اقامتی قرآنی تربیت گاہ

بھی منعقد ہوگی۔ جس میں رات کے 'بیان القرآن' پر مذاکرے کے علاوہ دیگر تعلیمی اور تدریسی پروگرام بھی جاری رہیں گے اخراجات طعام -/۵۰۰ روپے ہوں گے۔ چونکہ اقامتی گنجائش بہت محدود ہے، اور ایک محدود تر تعداد میں غیر مستطیع شرکاء کی مفت ضیافت کی کوشش بھی کی جائے گی۔ لہٰذا شرکت کے خواہشمند حضرات زیادہ سے زیادہ یکم مارچ تک اپنی عمر اور تعلیمی استعداد کی تفصیل اور مستطیع یا غیر مستطیع کی صراحت کے ساتھ درج ذیل پتہ پر ارسال کریں ـــــ

زین العابدین جوّاد۔ صدر انجمن خدّام القرآن سندھ

۱۱۔ داؤد منزل، فریئر روڈ، نزد آرام باغ، کراچی (فون: ۲۱۶۵۸۶)